ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

اکتوبر
سنہ ۱۹۸۴ء

مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

خسروِ شیرین زبان ، رنگین بیان
نغمه هایش از ضمیرِ کُن فکان

علامہ اقبالؒ

☆

پردۂ اعلاست عشق ، گر نگی ، این کشای
لُجۂ دریاست عشق ، گر گہری ، آن طلب

☆

چند مُرادت ز فقر ، کشف و کرامات چند
چون خضرت آشناست ، چشمۂ حیوان طلب

☆

شیر شو و صید را در تہِ چنگال کَش
مرد شو و خصم را بر سرِ میدان طلب

☆

ہر کہ شبِ زندہ داشت ہمدمِ روح اللہ است
نان چہ ربائی ز خوان ، چاشنیِ جان طلب

☆

مست شو ، ای ہوشیار ! لیک نہ زین بادہ خور
از قدحِ مُصطفیٰؐ بادۂ احسان طلب

(امیر خسرو)

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ماہنامہ حکمتِ قرآن، میں شائع شدہ مضامین و مقالات سے ادارے کی رائے کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون: ۸۵۳۶۱۱

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

ستمبر — اکتوبر — ۱۹۸۴ء

— مطابق —

ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ ، محرم الحرام ۱۴۰۵ھ

سالانہ زرِ تعاون — ۳۰/ روپے

اس شمارے کی قیمت — ۵/ روپے

— مطبع —

آفتاب عالم پریس ، لاہور

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ — کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور - فون ۸۵۲۶۱۱

فہرست

حرفِ اول — ڈاکٹر ابصار احمد	۳
سلسلۂ تقاریر الٓمٓ (سورۂ لقمان) — ڈاکٹر اسرار احمد	۶
توحیدِ عملی یا اخلاص فی العبادت کے انفرادی و اجتماعی تقاضے — حافظ عاکف سعید	۱۴
تحریکِ اسلامی کا ایک گم شدہ باب قیام دارالاسلام (پٹھانکوٹ) کی روداد — مرتبہ: جناب محمد یوسف	۲۷
درسِ حدیث (نزولِ مسیح) — ریاض الحق	۴۸
قرآنی ادب و ثقافت کا ایک پہلو (۲) — پروفیسر حافظ احمد یار	۵۶
قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت (۱۱) — مولانا محمد تقی امینی	۶۰
کتابیات: سیرۃ الخلیل (باب دوم) — مولانا الطاف الرحمن بنوی	۶۶
معاشرتی بہبود کا تعارف اور اس کے قرآنی تقاضے — محترمہ طاہرہ شاکر	۷۸
مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام (آخری قسط) — مولانا محمد طاسین	۸۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس حقیقت کے اعتراف و اظہار میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ ان کے شعور کی سب سے تحتانی سطح پر تو نقوشِ مرتسم ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کی ملّی شاعری کے، اور اُن کے بعد اُن کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ مؤثر عامل مولانا مودودی مرحوم کی تصانیف ہیں ——— پھر جس رُخ پر انہوں نے اپنی عملی جدّوجہد کو اُستوار کیا ہے اُس کے ضمن میں بھی اُن کا اپنا بیان کردہ موقف یہی ہے (ملاحظہ ہو اُن کی تالیف 'سرافگندیم' کا پیش لفظ) کہ وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کی زوردار دعوت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک دی اور اُس کے لیے ایک عملی جدّوجہد کا آغاز بھی کیا۔ اگرچہ بعض اسباب و موانع کے باعث جلد ہی بددل ہوکر اپنا رُخ تبدیل کر لیا۔ اُس سے جو خلا پیدا ہوا اُسے پُر کیا مولانا مودودی مرحوم نے لیکن وہ بھی کچھ عرصہ اُس راستے پر چل کر آزادیٔ ہند اور قیامِ پاکستان سے پیدا شدہ بعض 'مواقع' سے فریب کھاکر ایک دوسرے رُخ پر پڑ گئے ——— اور اب اُس سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ برادرِ محترم!

لہٰذا یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بھی پہلے "دارالارشاد" کے نام سے کلکتہ میں ایک ادارہ قائم فرمایا تھا اور پھر "حزب اللہ" کے نام سے شخصی بیعت کی اساس پر ایک جماعت قائم کی تھی۔ اسی طرح مولانا مودودی مرحوم نے بھی کچھ عرصہ 'ادارۂ دارالاسلام' کے ساتھ کام کیا ——— اور پھر قائم کی "جماعتِ اسلامی" ایک دستور کے ساتھ وفاداری کی اساس پر اور برادرِ محترم نے بھی اوّلاً ۱۹۵۸ء میں قائم کی 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' جس کے پیشِ نظر سب سے بڑا منصوبہ تھا "ایک ایسی قرآن اکیڈمی کا قیام جو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو پیش کر سکے" ——— اور چند سال بعد ۱۹۶۵ء میں قائم کی "تنظیمِ اسلامی" جس کی اساس "بیعتِ سمع و طاعت و ہجرت و جہاد" پر قائم ہے۔

ایک داعی کو بالخصوص اپنی جد و جہد کے ابتدائی مراحل میں جن حالات و واقعات کا سامنا ہوتا ہے ——— اور اس ضمن میں داخلی احساسات و جذبات کی جن کیفیات سے وہ گزرتا ہے اُس کا ایک نہایت دلچسپ مرقع مولانا مودودی مرحوم کی ایک تحریر سے سامنے آتا ہے جو انہوں نے "ادارۂ دارالاسلام" کی وقف کمیٹی کے سامنے ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو پیش کی تھی جسے ہم اس اشاعت میں معاصر "فاران" اور "ایشیا" کے شکریے کیساتھ شائع کر رہے ہیں۔

'ادارہ دارالاسلام' کا منصوبہ اصلاً علامہ اقبال مرحوم کے ذہن کی پیداوار تھا لیکن اس کے بانی جہانی چودہری نیاز علی خان مرحوم تھے ——— اور اگرچہ مولانا مودودی مرحوم کی پنجاب منتقلی علامہ مرحوم ہی کے ایما پر ہوئی تھی اور ستمبر ۳۷ء میں چودہری صاحب مرحوم کی معیت میں مولانا مرحوم کی علامہ اقبال مرحوم سے تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں جن میں منصوبہ کے عملی پہلو طے پائے نتیجۃً مولانا مرحوم ۱۶ مارچ ۳۸ء کو پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے لیکن پنجاب منتقلی کے بعد علامہ مرحوم سے ملاقات کی نوبت نہ آئی اور ۲۱ اپریل کو علامہ کا انتقال ہو گیا ——— چنانچہ اب ادارہ دارالاسلام کے ضمن میں سارا معاملہ مولانا مودودی مرحوم اور چودہری نیاز علی خان مرحوم اور اُن کے بعض رفقائے کار کے مابین رہ گیا ——— یہی وجہ ہے کہ اس تعلق میں کئی اتار چڑھاؤ آئے ——— اور مولانا مودودی مرحوم کو بہت سی ذہنی کشمکش اور عملی کشاکش سے سابقہ پیش آیا۔ جس کی تفصیلی کیفیات اس تحریر میں ہویدا ہیں۔

"مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" اور قرآن اکیڈمی کا معاملہ بحمداللہ اس سے بہت مختلف رہا۔ اس کا پورا خاکہ بھی برادر محترم ہی کے ذہن کی پیداوار تھا (ملاحظہ ہو "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام") اور پھر اس کی تشکیل بھی اسطرح ہوئی کہ پالیسی وغیرہ سے متعلق جملہ اختیارات تا زیست برادر محترم ہی کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا الحمدللہ ثم الحمدللہ گذشتہ بارہ سال سے یہ دونوں ادارے کامل خوش اسلوبی سے پروان چڑھ رہے ہیں۔

حسنِ اتفاق سے انہی دنوں قرآن اکیڈمی میں ایک بڑے منصوبے کا آغاز ہوا ہے۔ گذشتہ دو سال کے دوران تو اکیڈمی کی رفاقت سکیم کے تحت چھ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل پہلے گروپ کی تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ اِس سال چالیس سے زائد طلبہ پر

مشتمل ایک ایسے گروپ کی دوسالہ تدریس کا کورس شروع ہوا ہے جس میں نصف کے قریب ایف اے، ایف ایس سی، بی اے، بی ایس سی اور ایم اے، ایم ایس سی نوجوان ہیں۔ اور نصف کے قریب فارغ التحصیل اور برسرکار انجینئر، ڈاکٹر اور دوسرے "پیشہ ور" لوگ ہیں جنھوں نے اپنے کاروباری یا ملازمتی کیریرز میں سے دوسال تحصیلِ علم دین کے لیے نکالے ہیں! ——— اللہ تعالیٰ اِن سب حضرات کو استقامت عطا فرمائے اور ان میں سے چند ایک کو تو ضرور ہی اعلیٰ علمی سطح پر دین کی خدمت کے لیے قبول فرمالے ——— اور باقی حضرات کو حسبِ صلاحیت واستعداد دعوت وتبلیغِ دین کی توفیق ارزانی فرمائے۔ (آمین ثم آمین) —

اس سلسلے میں ایک صاحب کا ایک دلچسپ تنقیدی خط روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور میں شائع ہوا تھا جس کا جواب راقم الحروف نے اشاعت کے لیے ارسال کر دیا تھا خدا کا شکر ہے کہ معاصر مذکور نے اُسے معمولی قطع وبرید کے ساتھ شائع کر دیا ——— اس اشاعت میں قارئین کی دلچسپی کے لیے دونوں کے چربے بھی شائع کیے جا رہے ہیں۔

اس اشاعت میں مولانا محمد طاسین صاحب کے مقالے "مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام" کی آخری قسط شائع ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ اشاعت سے مولانا موصوف کا دوسرا طویل مقالہ جو "مضاربت" کے موضوع پر ہے سلسلہ وار شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔

"حکمتِ قرآن" کا یہ شمارہ دو ماہ کی اشاعتوں کا قائم مقام ہے۔ یعنی ستمبر اور اکتوبر ۱۹۸۳ء کا۔ اگرچہ اس پر درج صرف اکتوبر ۸۳ء ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ یہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ سے پہلے پہلے قارئین تک پہنچ جایا کرے گا۔

خاکسار

اسرار احمد

سلسلۂ تقاریر الٓمٓ

سورۂ لقمٰن

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم - نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم : امابعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ هُدًى وَّرَحْمَةً
لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى
هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

صدق اللہ العظیم

سورہ روم کے بعد قرآن حکیم میں سورۂ لقمان آتی ہے جو ۳۴ آیات اور چار رکوعوں پر مشتمل ہے - اس سورہ مبارکہ کا آغاز بہت مشابہ ہے سورہ بقرہ کے آغاز سے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ سورہ بقرہ کا آغاز بھی حروف مقطعات "الٓمٓ" سے ہی ہوتا ہے یہاں ارشاد ہوتا ہے۔

الٓمٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

جن لوگوں کی نگاہ قرآن حکیم پر ہے انہوں نے محسوس کر لیا ہوگا کہ کسقدر گہری مشابہت ہے ان آیات مبارکہ میں اور سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں، وہاں فرمایا گیا - الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

یہاں فرمایا گیا: الٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝
وہاں ارشاد ہوتا ہے - هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝
یہاں فرمایا گیا هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝
اور یہ ذہن میں رہے کہ درجۂ احسان بلند ترین مقام ہے کہ جس پر انسان فائز ہوسکتا ہے لہذا یہاں ہدایت کے ساتھ رحمت کا اضافہ کر دیا گیا -

سورۂ بقرہ میں ایمان بالغیب، اقامت صلوٰۃ، انفاق فی سبیل اللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر تھا ان آیات میں انفاق کی جگہ زکوٰۃ کی دینی اصطلاح آگئی اور ایمان بالآخرت کا ذکر آگیا - وہاں بھی ان اوصاف کے حامل اہل ایمان کو ہدایت اور فلاح سے شاد کام ہونے کی بشارت اور خوش خبری دی گئی تھی - یہاں بھی اس کا ذکر ہوگیا -

اس سورۂ مبارکہ کا اہم ترین حصّہ اس کا دوسرا رکوع ہے - جو حضرت لقمان کے ذکر اور ان نصیحتوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹے کو کی تھیں - سورۂ سابقہ یعنی سورۂ روم میں یہ بات آچکی ہے کہ قرآن حکیم جس دین کی طرف بلا رہا ہے - یا یوں کہیئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو دین لے کر آئے اور جس کی طرف آپؐ نے نوع انسانی کو دعوت دی - وہ دین فطرت ہے یہاں حضرت لقمان کے ذکر سے اسی دعوے کا اثبات کیا جا رہا ہے حضرت لقمان کے بارے میں مفسّرین اور محققین کا تقریباً اجماع ہے اس بات پر کہ نہ وہ نبی اور رسول تھے اور نہ ہی کسی نبی اور رسول کے امّتی تھے - وہ ایک حبشی النسل انسان تھے، جو حبشہ سے عرب کے شمالی علاقے میں آکر آباد ہوگئے تھے - وہ پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھے یعنی CARPENTER لیکن اللہ تعالےٰ کی دین ہے وہ جس کو چاہے دے اللہ نے انہیں فطرت سلیم عطا فرمائی اور عقل سلیم کی دولت سے نوازا - ان دونوں کے امتزاج سے انسانی سوچ جہاں تک پہنچ سکتی ہے، قرآن مجید

اس کے لئے اصطلاحاً حکمت کا لفظ استعمال کرتا ہے - ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ (آیت ۱۲)

"ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی تھی کہ کر شکر اللہ کا"

یہ بات ذہن میں رہے کہ انسان کی فطرت کی صحت کی علامت یہ ہے کہ اس میں جذبہ شکر پایا جائے - یعنی یہ کہ اگر کوئی اس کے ساتھ کوئی بھلائی کرے - اس کی کسی تکلیف کو دور کردے اسکی کوئی حاجت اور ضرورت پوری کردے اسے کوئی انعام اور نعمت دے تو اس کے لئے ایک خاص جذبہ تشکر اسکے قلب کی گہرائیوں سے اُبھرنا چاہیئے - جو اس کی زبان پر کلمات شکر کی صورت میں بھی جاری ہو اور اس کے پورے وجود میں سرایت کر جائے -

چنانچہ وہ اپنے منعم کے لئے سراپا تشکر و امتنان بن جائے - اگر فطرت درست ہے تو انسان کے اندر اس کیفیت کا ہونا لازمی ہے اِلّا آنکہ فطرت مسخ ہو چکی ہو اس کے سوتے خشک ہو چکے ہوں دوسری طرف عقلِ سلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے اصل منعم کو پہچانے - اصل محسن اور اصل منعم - چنانچہ عقل سلیم کی روشنی میں جب انسان غور کرتا ہے تو وہ پہچان لیتا ہے کہ منعمِ حقیقی محسنِ حقیقی اللہ ہے - وہ ربّ العالمین ہے وہی ہمارا پالنے والا اور پرورش کرنے والا ہے - اب ان دونوں چیزوں کا جمع حاصل یہ ہے کہ:

اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ

کر شکر اللہ کا - البتہ شکر کا معاملہ یہ بھی ہے کہ منعم کا حق ادا کیا جائے - اللہ کے شکر کا جو لازمی نتیجہ نکلنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ اللہ کو پہچانو اور اللہ کے حقوق ادا کرو - اور اللہ کے حقوق کو اگر ایک لفظ میں جمع کیا جائے تو وہ التزامِ توحید ہے - اسکو ایک جانو، ایک مانو اور اُسی ایک ہی کو پوجو اور اُسی ایک ہی کی پرستش کرو اور اس ایک ہی سے محبّت کرو -

اسی کو اپنا مطلوب و مقصود بناؤ۔ اسی کو اپنا محبوبِ حقیقی بناؤ۔
یہ ہے اللہ تعالیٰ کے حقوق کو اگر ایک لفظ میں ادا کیا جائے تو اس کا حق ہے التزامِ توحید اور اجتناب عن الشرک ۔ چنانچہ یہی وہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی ۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ
بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (آیت ۱۳)

"اور یاد کرو کہ جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا جبکہ وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' اے میرے بچے اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا۔ واقعہ یہ ہے کہ شرک بہت بڑی زیادتی' بہت بڑی ناانصافی ہے"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حقوق کے ضمن میں ایک بات کی مزید وضاحت فرما دی۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ہیں لیکن بندوں کے حقوق بھی ہیں۔ اور حقوق العباد میں سے اوّلین اور فائق ترین حق والدین کا ہے۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ

"ہم نے انسان کو وصیّت کی ہے' تاکید کی ہے اس کے والدین کے بارے میں کہ وہ ان کا حق ادا کریں۔" اور ظاہر بات یہ ہے وصیّت وہی ہے جو فطرت انسانی میں ودیعت شدہ چیز ہے۔ انسان اپنی فطرت سے جانتا ہے کہ اسے اپنے والدین کا ادب اور احترام کرنا چاہیئے ان کا کہنا ماننا چاہیئے۔ ان کی دلجوئی اور تشفی کرنی چاہیئے۔ ان کے حقوق ادا کرنے چاہئیں۔ ان کی خدمت کرنی چاہیئے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ وہ بڑھاپے کی اس عمر کو پہنچ گئے ہوں کہ ان کے اوپر احتیاج کا غلبہ ہو جائے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے فوراً بعد والدین کے حق کا ذکر فرمایا۔

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ

حضرت لقمان کی پھر تیسری نصیحت یہ سامنے آئی کہ اے میرے بچے!

اس حقیقت کو ذہن نشین کر لو کہ اعمال انسانی خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹے ہوں - یہانتک کہ رائی کے دانے کے ہم وزن ہوں، ضائع ہونے والے نہیں ہیں - نیکی ہو یا بدی، اللہ اس کو لے آئے گا خواہ کہیں پہاڑ کی کھوہ میں گھس کر وہ عمل کیا گیا ہو - خواہ زمین کے پیٹ میں گھس کر کیا گیا ہو خواہ فضا یا خلاء کی پہنائیوں میں کیا گیا ہو، اللہ اس کو لے آئے گا -

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ

اس کے بعد اور جامع ترین نصیحت آتی ہے يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ - اے میرے بچے! اللہ کو جان لینا اور مان لینا ہی کافی نہیں - اسکے ساتھ ایک مضبوط تعلق قائم رکھنا ضروری ہے اور اس تعلق مع اللہ کے لئے ذریعہ ہے نماز - لہذا نماز کو قائم رکھ پھر دنیا میں حق کا پرچار کرنے کے لئے حضرت لقمان نصیحت فرماتے ہیں - وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور نیکی کا حکم دے اس کا پرچار کر اسے پھیلا اور منکر سے روک اور منکر کے خلاف لوگوں کو نصیحت و تلقین کر اور فرمایا:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۷)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہیں اس لئے کہ ان پر مخالفت بھی ہوتی ہے، ان کی وجہ سے بسا اوقات انسان بڑی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے - لوگوں کی طرف سے شدید مخالفت ہوتی ہے - لوگ استہزاء بھی کرتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسمانی اذیت بھی برداشت کرنی پڑتی ہے - تو اب جو بھی آئے جو بھی جھیلنا پڑے اسے جھیلو اور برداشت کرو بلاشبہ صبر کرنا بڑے حوصلے اور ہمت کے کاموں میں سے ہے -

حضرت لقمان کے یہ نصائح، واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی اس دعوت کا

لب لباب ہیں جو سورۃ العصر میں انتہائی مختصر الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

وہی مضمون ہے کہ جو ان نصائح کے اندر آگیا ہے گویا کہ جو دعوت قرآن کی ہے وہی دعوت حضرت لقمان کی بھی تھی جو ایک سلیم الفطرت انسان تھے صحیح العقل انسان تھے۔ یہ گویا کہ اہل عرب پر حجت قائم کی جا رہی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں، یہ جان لو کہ وہ دعوت فطرت اور عقل کی بنیاد پر ہے اور خود تمہارے ماضی میں ایک ایسی شخصیت جسکی عظمت کے تم خود قائل ہو۔ جن کے اقوال تم یہاں بیان (Quote) کرتے ہو اپنے خطبات میں اور اپنے اشعار میں وہ بھی اپنے تمام غور و فکر کے نتیجہ میں انہی باتوں تک پہنچے تھے کہ جن باتوں کی دعوت قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے رہے ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں شکر کے مضمون کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بہت اجاگر کیا گیا ہے۔ گویا کہ قرآن مجید ہی کی اصطلاح میں

التذکیر بآلاء اللہ

اللہ کی نعمتوں کے حوالے سے اللہ کی معرفت کو اجاگر کرنا اور اللہ پر ایمان کی دعوت۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے آیت نمبر ۲۰ میں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (۳۰)

لوگو! کیا تم نے غور نہیں کیا، سوچا نہیں۔ اللہ نے کس طرح تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسے مسخر کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمتوں کو کامل فرما دیا ہے۔ اے بنی نوع آدم! وہ نعمتیں جو ظاہری ہیں اور وہ نعمتیں جو باطنی ہیں ان نعمتوں کا تم پر اتمام ہو گیا ہے۔

اس کے بعد آیت نمبر ۳۱ میں پھر ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

تم دیکھتے نہیں اللہ تعالےٰ کی کتنی بڑی نشانی ہے کہ کشتی چلتی ہے دریاؤں میں اور سمندروں میں تمہارے لئے بہت سی چیزیں اور سروسامان لے کر یہ بھی اللہ تعالےٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اس میں نشانی ہے ہر اس شخص کے لئے جو صبر کرنے والا ہو۔ اور شکر کرنے والا ہو۔

آخری بات یہاں بھی وہی ہے۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

یہاں پر جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اے مسلمانو! اے محمد کے جاں نثارو! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اے قرآن اور محمدؐ پر ایمان لانے والو، یہ حالات یہ شدائد اور مصائب عارضی ہیں یہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم ثابت قدم رہے تو اللہ تعالےٰ کی نصرت و تائید تمہارے شامل حال ہوگی۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

اللہ کا یہ وعدہ بالکل سچا ہے اس پر پورا یقین محکم قائم رکھو۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۪ وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ (۳۳)

تو دیکھنا کہیں تمہیں یہ دُنیا کی زندگی دھوکے میں مبتلا نہ کردے۔ کہیں تم اس حیات دنیوی کی زلف گرہ گیر ہی کے اسیر ہوکر نہ رہ جاؤ۔ کہیں تم آخرت اور اللہ سے منہ نہ موڑ لو۔ اس دُنیا کی طلب میں اور اسکی رونقوں اور اس کی چہل پہل اور اسکی چمک دمک سے شیطان یعنی ابلیس تمہیں یہ سُجھا کر اور یہ سمجھا کر کہ اللہ بڑا غفور ہے بڑا بخشنے والا ہے کہیں تمہاری جرأتیں معصیت پر گناہ پر بڑھا نہ دے۔ اسکی شان مغفرت اور شان غفاری پر دھوکہ

نہ کھا جانا۔ جہاں وہ غفور رحیم ہے، وہیں وہ عادل بھی ہے منتقم بھی۔ شدید العقاب بھی ہے۔ سزا دینے میں بہت سخت بھی ہے۔

آخری آیۂ مبارکہ بہت اہم ہے۔ علم غیب صرف اللہ کے لئے ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ

اللہ ہی کو معلوم ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ اس کا علم اسی کے پاس ہے۔ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ

وہی بارش برساتا ہے کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کب بارش ہوگی۔ آج بھی ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہماری ساری پیش گوئیاں اکثر و بیشتر غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ حتمی اور یقینی طور پر پیشگوئی نہیں کی جا سکتی یہ بھی علم خاص اللہ کا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ

رحم مادر میں کیا ہے لڑکا ہے یا لڑکی۔ اسے بھی آج تک اپنی ساری سائنسی ترقیوں کے باوجود ہم نہیں جان سکتے۔ یہ علم بھی وہ ہے کہ جو اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ

کسی ذی نفس کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کریگا۔ نیکی کمائے گا یا بدی کمائے گا۔ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ

اور کسی نفس کو معلوم نہیں کہ اس کی موت کس سرزمین میں واقع ہوگی۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (۳۴)

سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر تو صرف اللہ ہے۔

اس حقیقتِ کبریٰ کے بیان پر یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوتی ہے۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم
ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

توحیدِ عملی یا اخلاص فی العبادت کے انفرادی اور اجتماعی تقاضے

(سورہ زمر تا سورہ شوریٰ کی روشنی میں)

(یہ مقالہ محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۸۴ء میں پیش کیا گیا)

عاکف سعید فیلو (رفیق) قرآن اکیڈمی

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ط اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ۔ صدق اللّٰہ العظیم

جنابِ صدر، محترم علمائے کرام اور معزز حاضرین! میرے مقالے کا عنوان، جیسا کہ آپ حضرات نے سماعت فرمایا، کچھ یوں ہے "توحیدِ عملی یا اخلاص فی العبادت کے انفرادی اور اجتماعی تقاضے: سورۃ زمر تا سورۃ شوریٰ کی روشنی میں"۔ یہ عنوان قدرے طویل بھی ہے اور کسی حد تک عسیر الفہم بھی۔ لہٰذا ابتداء میں مجھے عنوان کے سلسلے میں بعض چیزوں کی وضاحت کرنا ہوگی۔

سب سے پہلی وضاحت کا تعلق، فطری طور پر، اس بات سے ہے کہ اس عنوان کا انتخاب کیوں ہوا! تو صورتِ واقعہ یہ ہے کہ آج سے چند ماہ قبل والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد شہداء میں اپنے سلسلہ وار درسِ قرآن کے ضمن میں سورۃ شوریٰ کا درس دیا تھا۔ دورانِ درس انہوں نے توحیدِ نظری اور توحیدِ عملی کے فرق کو وضاحت سے بیان کیا اور خصوصاً اس نکتے کو بہت خوبصورتی سے واضح کیا کہ اقامتِ دین درحقیقت توحیدِ عملی کا لازمی تقاضا ہے۔ جو اجتماعی سطح پر سامنے آتا ہے۔ بعد ازاں والد صاحب ہی کے کہنے پر میں نے ان نکات کو مدِنظر رکھتے ہوئے سورۃ زمر تا سورۃ شوریٰ کے مضامین کا اجمالی جائزہ

مرتب کیا جو اصلاً تو ماہنامہ حکمتِ قرآن کے لئے تھا تاہم موقع کی مناسبت سے محاضراتِ قرآنی کے پلیٹ فارم سے آپ حضرات کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

دوسری بات جو مجھے تمہیداً عرض کرنی ہے وہ قرآن حکیم کی سورتوں کے گروپ سے متعلق ہے ـــــ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک تقسیم وہ ہے جو دورِ صحابہؓ سے منقول ہے یعنی سات احزاب کی صورت میں قرآن حکیم کی سورتوں کی تقسیم ـــــ اس تقسیم سے ہم سب بخوبی واقف ہیں ـــــ اس تقسیم کا پس منظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر صحابہؓ کا یہ معمول تھا کہ وہ ایک ہفتے میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ سہولت کی غرض سے قرآن کو سات لگ بھگ مساوی حصّوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ لیکن اس تقسیم میں یہ امر ملحوظ رہا کہ سورتوں کے حصار ٹوٹنے نہ پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان احزاب کے حجم میں کسی قدر تفاوت رہ گیا ہے۔ اوسطاً ہر حزب ساڑھے چار یا پانچ پاروں پر مشتمل ہے۔

قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپ بندی ماضی قریب میں کی گئی۔ اس کی رُو سے بھی قرآن حکیم کی سورتوں کے سات ہی گروپ وجود میں آتے ہیں۔ اس تقسیم کو منظرِ عام پر لانے کا سہرا جس مکتبِ فکر کے سر ہے اس کے بانی امام حمید الدین فراہیؒ تھے۔ مولانا قرآن سے ایک خصوصی شغف رکھتے تھے اور ان کا خاص موضوع تھا نظمِ قرآن۔ یعنی قرآن حکیم کی سورتوں اور آیات کے مابین ربط و تعلق۔ نئی تقسیم کے تحت قرآن حکیم کی سورتوں کی جو گروپ بندی کی گئی ہے اس میں مکّی اور مدنی سورتوں کی ترتیب کو مدِّنظر رکھا گیا ہے ـــــ اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ قرآن حکیم کا قریباً ۲/۳ حصہ مکّے میں نازل ہوا اور بقیہ ۱/۳ حصّے کا نزول مدینے میں ہوا۔ اور یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں کہ مصحف کی ترتیب نزولی ترتیب سے بہت مختلف ہے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مکّی سورتوں اور مدنی سورتوں کو اس طور سے علیحدہ علیحدہ جمع کر دیا گیا ہو کہ پہلے تمام مکّیات آجائیں اور بعد میں مدنی سورتیں ـــــ بلکہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ مکّی اور مدنی سورتیں مصحف میں منتشر (Scattered) حالت میں ہیں ـــــ بادی النظر میں مکّیات اور مدنیات کی اس تقسیم میں کوئی واضح ترتیب نظر نہیں آتی۔ لیکن درحقیقت معاملہ وہی ہے کہ ع

ربطِ محکم اسی بے ربطیٔ تحریر میں ہے

چنانچہ جب ان مکّی اور مدنی سورتوں کی اس بظاہر بے ربط تقسیم کا بنظرِ غائر جائزہ لیا گیا تو

اس میں ایک خوبصورت ترتیب اور نہایت بامعنی تقسیم کا مشاہدہ ہوا۔ اس تقسیم کی رو سے قرآن کی سورتوں کے جو سات گروپ بنتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر۔ اور اس طرح مکی اور مدنی سورتوں کے باہم ملنے سے ایک گروپ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن حکیم کی سب سے پہلی سورۃ، سورۃ فاتحہ ہے جو مکی سورۃ ہے۔ اس کے بعد چار طویل مدنی سورتیں ہیں (یعنی سورۃ البقرہ، آل عمران، نساء اور المائدہ)۔ یہ ایک گروپ ہوا۔ پھر سورۃ انعام اور اعراف مکی ہیں اور انفال اور توبہ مدنی سورتیں ہیں۔ ان کے مجموعے سے دوسرا گروپ تشکیل پاتا ہے۔ تیسرے گروپ میں سورۃ یونس، سورۃ ھود، سورۃ یوسف، سورۃ الرعد، سورۃ ابراہیم اور سورۃ الحجر مکی سورتیں ہیں جبکہ مدنی سورۃ صرف ایک ہے یعنی سورۃ نحل۔ اس طرح یہ گروپ مکمل ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس!

فراہی مکتب فکر ہی کے حوالے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہوتا ہے۔ عمود کی اصطلاح کا ذکر ہمیں شاہ ولی اللہ کے ہاں بھی ملتا ہے ـــــ بہرکیف اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں جن کے اجتماع سے تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اسی طرح سورۃ کے عمود یا مرکزی مضمون کے بھی عموماً دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک رُخ گروپ میں شامل مکی سورتوں سے واضح ہوتا ہے تو دوسرے رُخ کو اسی گروپ میں شامل مدنی سورتیں نمایاں کرتی ہیں۔ گویا ہر گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتیں مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں ـــــ بلاشبہ نظمِ قرآن کے فہم کے ضمن میں یہ تحقیق ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں مجھے جن چار سورتوں کے حوالے سے توحید عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں پر گفتگو کرنی ہے ان کا تعلق مذکورہ بالا تقسیم کے تحت وجود میں آنے والے سات گروپوں میں سے پانچویں گروپ کے ساتھ ہے جس کا آغاز ۲۲ ویں پارے میں سورۃ سبا سے اور اختتام سورۃ الحجرات پر ہوتا ہے جو ۲۶ ویں پارے کے نصف آخر میں ہے ـــــ اس گروپ کا مرکزی مضمون "توحید" ہے۔ گروپ میں شامل مکی سورتوں میں اثباتِ توحید اور ابطالِ شرک کا بیان نہایت شد و مد کے ساتھ اور انتہائی جامع اور پُرجلال انداز میں ہوا۔ سورۃ یٰسٓ اسی گروپ میں شامل ہے جو بلاشبہ توحید کے بیان میں ایک

منفرد شان کی حامل سورۃ ہے۔ غالباً اسی لئے حضورؐ نے اس سورۃ کو قلب قرآن قرار دیا تھا۔

——— بیان توحید کے ضمن میں اس گروپ کی مکی سورتوں میں ہمیں ایک دلچسپ تقسیم نظر آتی ہے۔ اس سلسلے کی پانچ پہلی مکی سورتیں یعنی سورۃ سبا، سورۃ فاطر، سورۃ یٰسٓ، سورۃ صٰفّٰت اور سورۃ صٓ توحید کے اعتقادی پہلو یعنی توحید نظری یا توحید فی المعرفۃ سے بحث کرتی ہیں اور بعد کی چار سورتیں یعنی سورۃ زمر، سورۃ مومن، سورۃ حم السجدہ اور سورۃ شوریٰ درحقیقت توحید عملی یا توحید فی الطلب کے مباحث پر مشتمل ہیں ——

توحید نظری یا توحید فی المعرفۃ اور توحید عملی یا توحید فی الطلب ایسی اصطلاحات کی وضاحت سے قبل میں چاہوں گا کہ ہم لفظ توحید کے اصل مفہوم کی جانب توجہ کو مرکوز کریں۔ اس مفہوم کی جانب رہنمائی بھی والد محترم کے درس کے ذریعے ہوئی ——— ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں وَحِّدُوا اللّٰہَ فَاِنَّ التَّوحِیدَ رَأسُ الطَّاعَاتِ ——— وَحِّدُوا فعل امر ہے اور باب تفعیل ہے۔ باب تفعیل کی خاصیت ہے کہ اس میں اہتمام اور تدریج پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ توحید ایک پیہم عمل ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لفظ تعلیم کے معنی ہیں درجہ بدرجہ سکھانا اور تنزیل کے معنی ہیں جستہ جستہ اتارنا۔ اسی طرح توحید بھی ایک پیہم عمل ہے۔ اس کے کئی مراحل ہیں محض کلمہ پڑھ لینے سے توحید کی آخری منزل تک رسائی نہیں ہو جاتی بلکہ اللہ کو ایک مان کر پوری مستقل مزاجی اور استقامت کے ساتھ پیہم اس کی اطاعت کی روش پر کاربند ہو جانا اور شرک کی ہر آلائش کو اپنے فکر و عمل سے دور کرتے چلے جانا درحقیقت توحید ہے۔ ایک موحد کی قلبی کیفیات کا اظہار دراصل وہ نعرۂ مستانہ ہے جو حضرت ابراہیم نے شرک کی ظلمتوں میں ڈوبے ہوئے معاشرے میں بلند کیا تھا۔ کہ اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ۔

اب ہم توحید نظری اور توحید عملی کی اصطلاحات کی طرف آتے ہیں۔ توحید نظری یا توحید اعتقادی کے لئے امام ابن تیمیہ نے توحید فی المعرفۃ کی اصطلاح اختیار کی ہے مراد یہ ہے کہ انسان اعتقادی طور پر اللہ کو ایک جانے، ایک مانے، اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ کرے۔ کسی کو اس کا ضد، ند، مثل، مثیل، ہم کفو یا ہم پلہ نہ قرار دے۔ گویا توحید فی الذات اور توحید فی الصفات دونوں کو جمع کر دیا جائے تو یہ ہوگی توحید

نظری یا توحید فی المعرفۃ ـــــــ دوسری جانب توحید عملی کے لئے امام ابن تیمیہؒ کی اصطلاح ہے توحید فی الطلب۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی اس کی بندگی کے سانچے میں ڈھل جائے۔ زندگی کے ہر معاملے میں وہ اللہ کی اطاعت کے اصول پر کاربند ہو۔ شیطانی ترغیبات، نفس کی خواہشات وشہوات اور معاشرے کا دباؤ، ان میں سے کوئی چیز اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کے آڑے نہ آنے پائے۔ گویا بندگی، پرستش اور اطاعت اسی اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ عملی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے دائرے سے باہر مخلوقات میں سے کسی کی اطاعت اگر ہو گی تو یہی شرک فی الاطاعت یا شرک فی العبادت ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃِ الخالق (کسی ایسے معاملے میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی جس سے خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔ چنانچہ شرک فی العبادہ سے بچنا اور اطاعت کو اللہ کے لئے خاص کر لینا ہی توحید عملی کا تقاضا ہے۔ گویا توحید جب انسان کے عمل میں سرایت کرتی ہے تو بندگیٔ رب کی صورت میں ظہور کرتی ہے۔

ـــــــ اجمالاً یہ جان لیجئے کہ توحید عملی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک انفرادی سطح اور دوسری اجتماعی سطح۔ انفرادی سطح پر توحید عملی یہ ہو گی کہ ہر فرد اپنی ذات میں اللہ کا بندہ بن جائے۔ صرف اسی کی بندگی اور اطاعت کرے۔ بندگی اور اطاعت میں کسی اور کو اس کا شریک نہ کرے۔ جبکہ اجتماعی سطح پر توحید عملی کا تقاضا یہ ہو گا کہ حاکمیتِ غیر کے ہر تصور کی نفی کر کے معاشرے پر بحیثیت مجموعی اللہ کے دین اور اس کی شریعت کو غالب و نافذ کیا جائے۔ اور حاکمیت الٰہی کے تصور پر مبنی نظام عدل و قسط بالفعل قائم کر دیا جائے۔ ہم دیکھیں گے کہ توحید عملی کا بیان ان چار سورتوں یعنی سورۃ زمر، سورۃ مؤمن، سورۃ حم السجدہ اور سورۃ شوریٰ میں ایک خاص تدریج کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

چنانچہ سورۃ زمر سے توحید عملی کی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سورۃ میں توحید عملی کے انفرادی پہلو یعنی بندگیٔ رب کے مضمون کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سورۃ کے آغاز میں حضورؐ کو ان الفاظ میں مخاطب کیا گیا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ـــ "اے نبیؐ! ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ پس آپ بندگی کریں اللہ کی۔ اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ آگاہ رہو! اللہ ہی کے لئے ہے دین خالص یعنی مخلصانہ اطاعت"

——— اور یہ عبادت رب اور اخلاص فی الدین کا مضمون اس سورۃ میں جا بجا مختلف اسالیب سے سامنے آتا ہے۔ چنانچہ آیات ۱۱ تا ۱۴ میں پھر اسی مضمون کی تکرار ہے۔ فرمایا: قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۔ "اے نبی! آپ کہہ دیجئے مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں، اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ آگے ارشاد ہے ۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ مجھے تو یہ حکم ہے کہ میں خود سب سے پہلے فرمانبردار بنوں۔ یعنی جب نظری اور علمی طور پر توحید کا قائل ہوں تو اپنے عمل سے اس کا مظاہرہ کیوں نہ کروں۔ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۔ "اور اے نبی کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے اس بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے ——— پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ببانگ دہل کہلوایا گیا کہ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِیْنِیْ ۔ اے نبی! کہہ دیجئے کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتا ہوں۔ دین اور اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آغاز سورۃ میں جو الفاظ آئے کہ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۔ انہی الفاظ کو مختلف اسالیب سے تکرار سامنے لایا جا رہا ہے۔ سورۃ بینہ میں بھی یہ الفاظ اسی ترتیب کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ الفاظ قرآن حکیم میں کسی اور مقام پر اتنے اہتمام سے اور تکرار وارد ہوئے ہوں ——— حقیقت یہ ہے کہ توحید عملی کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ بندگی کسی اور کی نہ ہو۔ سوائے اللہ کے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ اور اطاعت خالص ہو جائے اللہ کے لئے۔ اللہ کی اطاعت سے آزاد کسی غیر کی مرضی کے سامنے جھک گئے تو یہی شرک فی العبادۃ ہے۔ اور یہ بات نہایت شدّ و مد کے ساتھ سورۃ زمر کے آخر میں حضورؐ کی زبان سے کہلوائی جا رہی ہے۔ نہایت اچھوتا اسلوب ہے اور یہ اس مضمون کا نقطۂ عروج ہے قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۔ اے نبی! کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! اے نادانو! کیا تم مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت اور اطاعت کرنے لگوں۔ اس سے اگلی آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر بفرض محال ایسا ہو گیا تو یہ بات شرک کے زمرے میں داخل ہو جائے گی ۔ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۔

یہاں ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ نصف پارے پر محیط یہ سورۃ چونکہ تمام تر عبادتِ رب اور اخلاص فی الدین کے مضمون کے گرد گھومتی ہے، اس لئے اس سورۃ میں جہاں بھی اہل ایمان کو جمع کے صیغے میں مخاطب کیا گیا تھا وہاں اس خاص امر کی رعایت کی گئی ہے۔ چنانچہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ کی بجائے یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے بندو! جو ایمان لائے ہو) اور یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ (اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔ نہایت شفقت بھرا انداز ہے۔ اس سورۃ میں تین بار یہ اسلوب اختیار کیا گیا۔ جبکہ قرآن مجید کی کسی اور سورۃ میں اس طرح بتکرار یہ پیرایۂ خطاب[1] کہیں اور نظر نہیں آتا۔

سورۃ زمر کے متصلاً بعد سورۃ مؤمن ہے۔ سورۃ زمر میں جس موضوع کو مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل تھی یعنی عبادتِ رب اور اخلاص فی الاطاعت، اسی کے ایک دوسرے رُخ کو اس سورۃ میں اجاگر کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ عبادت کا مغز اور جوہر ہے "دعا"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا جوہر ہے) بلکہ آپؐ نے تو یہاں تک فرمادیا کہ: الدعاءُ ھو العبادۃ۔ (دعا ہی دراصل عبادت ہے) چنانچہ سورۃ مؤمن کا مرکزی مضمون بھی یہی ہے یعنی "دعا"۔ سورۃ زمر اور سورۃ مؤمن کے اسلوب میں بھی حد درجہ مماثلت نظر آتی ہے۔ سورۃ زمر میں عبادتِ رب کا مضمون ان الفاظ وارد ہوا تھا کہ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ۔ اور سورۃ مؤمن میں دعا کا مضمون بالکل اسی انداز میں بیان ہوا یعنی فَادْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (اللہ کو پکارو دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے)۔ اخلاص فی الدین کی قید یہاں بھی موجود ہے۔ یہ اس لئے کہ توحید عملی کا لازمی تقاضا ہے کہ دین کو یعنی اطاعت کو اللہ کے لئے خالص کر دیا جائے۔ اسی سورۃ میں دعا کی عظمت کے ضمن میں وہ عظیم آیتِ مبارکہ بھی نازل ہوئی جو آپ میں سے اکثر نے خطباتِ جمعہ میں سنی ہوگی۔ وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ

---

[1] اس پیرایۂ خطاب کی قرآن مجید میں صرف ایک نظیر اور ملتی ہے اور وہ ہے سورۃ عنکبوت کی آیت ۵۶ جس میں فرمایا گیا: یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ۔

جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ـــ (اور تمہارے رب نے کہہ دیا ہے کہ مجھے پکارو۔ مجھ سے دعا کرو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا" اور وہ لوگ جو تکبر اور استغنا کی وجہ سے اللہ کو پکارنے سے اور اس کے سامنے دست دعا پھیلانے سے اعراض کرتے ہیں ان کو یہاں سخت وعید سنا دی گئی کہ "یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔ اس آیت میں آپ حضرات نے نوٹ کر لیا ہو گا کہ عبادت اور دعا کے الفاظ ساتھ ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ گویا یہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔

آیت نمبر ۶۶ میں پھر عبادت اور دعا کا مضمون ساتھ ساتھ وارد ہوا۔ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ مجھے تو روک دیا گیا ہے اس بات سے کہ میں عبادت کرنے لگوں ان ہستیوں کی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ جن سے دعائیں کرتے ہو۔

اس سورۃ میں اہل جہنم کے تذکرے میں بھی دو بار دعا کا مضمون وارد ہوا ہے۔ آیت نمبر ۵۰ میں اہل جہنم اور جہنم کے پہرہ داروں کے مابین مکالمے میں یہ مضمون آیا ہے کہ ایک موقع پر جہنم کے پہرہ دار اہل جہنم کی فریاد پر تنگ آ کر یہ کہیں گے کہ فَادْعُوْا: اب پکارو اپنے رب کو اور خوب واویلا کرو۔ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ۔ لیکن اس موقع پر کافروں کا پکارنا اور انکی دعا نتیجہ خیز نہیں ہو گی بلکہ ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گی۔ اسی طرح آیت نمبر ۷۴ میں اس سے ملتا جلتا مضمون وارد ہوا ہے۔ جہاں اہل جہنم صاف انکار کر دیں گے۔ اور کہیں گے کہ ہم اس سے پہلے کسی کو نہیں پکارتے تھے۔ بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا

مختصراً یہ کہ سورۃ زمر اور سورۃ مومن دونوں توحید عملی کے اس پہلو پر بحث کرتی ہیں جو انفرادی سطح پر توحید عملی کے لازمی تقاضے کے طور پر سامنے آتا ہے ـــ یعنی عبادتِ رب اور اخلاص فی الدین جس کا ذکر پورے شرح و بسط کے ساتھ سورۃ زمر میں ملتا ہے اور عبادت ہی کا ایک پہلو "دعا" جو مرکزی مضمون ہے سورۃ مومن کا۔ گویا عملی میدان میں توحید کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ بندگی اور پرستش صرف اللہ کی ہو گی۔ اطاعت کو تمام تر اس کے لئے خالص کرتے ہوئے اور دوسرا تقاضا یہ ہے کہ دعا بھی صرف اسی ذاتِ واحد سے

کی جائے گی عملاً کسی اور کو پکارنا 'دعا' استعانت یا مدد طلب کرنا توحید کے یکسر منافی ہے۔ انہی دو تقاضوں کا اقرار ہم نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے دوران کرتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ اے پروردگار ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے استعانت کرتے ہیں۔ مدد مانگتے ہیں یعنی ہر حال میں صرف تجھی کو پکارتے ہیں۔

سورۃ زمر اور سورۃ مومن کے بعد سورۃ حٰمٓ السجدہ اور سورۃ شوریٰ ہیں۔ مؤخر الذکر دو سورتوں میں توحید عملی کے ان تقاضوں کا ذکر ہے جن کا تعلق اجتماعی سطح سے ہے۔ یعنی انفرادی سطح پر تو توحید عملی کا تقاضا بندگیٔ رب اور دعا کی صورت میں سامنے آیا اب بقیہ دو سورتوں میں یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ اجتماعی سطح پر توحید عملی کا تقاضا کیا ہے؟ یعنی معاشرے اور نظام پر توحید کس صورت میں اثر انداز ہوتی ہے ـــــ اور اس سطح پر توحید کس بات کی متقاضی ہوتی ہے؟ ـــــ اجتماعی سطح پر توحید عملی کا جو تقاضا سامنے آتا ہے اس کے دو رُخ ہیں یا یوں کہہ لیں کہ دو پہلو یا دو مراحل ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ جب انسان اپنی ذات کی حد تک عبادت رب پر کاربند ہو جائے اور واقعتہً اطاعت کو اسی کے لئے خالص کر دے تو اب توحید ہی کا یہ تقاضا ہے کہ خلق کو اللہ کی بندگی کی طرف بلائے۔ دوسروں کو بھی اسی بات کی دعوت دے۔ اس لئے کہ ہر انسان اپنے معاشرے کا جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ معاشرے پر توحیدی رنگ غالب کرنے کے لئے جدوجہد کرے۔ **چنانچہ پہلا مرحلہ یہی ہے کہ وہ خلق کو اللہ کی طرف بلائے۔ یعنی دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دے اور یہ مرکزی مضمون ہے** سورۃ حٰمٓ السجدہ کا۔ اسی طرح توحید ہی کا تقاضا ہے کہ جس نظام کے تحت وہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ نظام بھی حاکمیت الٰہی کے اصول پر مبنی نظام ہو۔ اور اگر نظام غیر اللہ کی حاکمیت پر مبنی ہے تو ایک مشرکانہ نظام ہے اور کسی موحد کے لئے اس ماحول میں سانس لینا بھی حرام ہے۔ الا آنکہ وہ اس کو بدلنے کے لئے بھرپور جدوجہد کرے۔ چنانچہ اگر وہ فی الواقع توحید کا قائل ہے تو پھر توحید کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے دین کو قائم کرے اور عدل و قسط پر مبنی نظام رائج و نافذ کرے۔ بالفاظِ دیگر دوسرا مرحلہ ہے اقامتِ دین اور یہ مرکزی مضمون ہے سورۃ شوریٰ کا جو ترتیب کے اعتبار سے ان چار سورتوں میں آخری ہے ـــــ!!!

سورۃ حم السجدہ کی آیات ۳۳ تا ۳۶ میں دعوت الی اللہ کا مضمون بڑے جامع اور دلنشین انداز میں وارد ہوا ہے ـــــ ان آیات میں مقامِ دعوت کے ساتھ ساتھ دعوت کے لوازم کو بھی سمو لیا گیا ہے ۔ فرمایا ۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ " اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جس نے بلایا اللہ کی طرف اور عمل کئے صالح اور کہا کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں" ـــــ اگلی آیت میں مقامِ دعوت کی مناسبت سے ہدایات بھی دے دیں کہ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ " نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں ۔ دفاع کرو اس طور سے جو بہترین ہو ۔ نتیجۃً وہی شخص کہ تمہارے اور اس کے مابین عداوت تھی ایسے ہو جائے گا گویا گرم جوش ساتھی ۔

داعی کے لئے ایمان کس درجے کا مطلوب ہے اس کی جانب اشارہ کر دیا گیا ۔ اس سورۃ کی آیت نمبر ۳۰ میں کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا " یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے " اس مرحلے پر غیر متزلزل ایمان اور حد درجہ استقامت مطلوب ہے ۔

آیت نمبر ۳۵ میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اس مقام تک وہی پہنچ پاتے ہیں جن میں صبر کرنے اور برداشت کرنے کا مادہ موجود ہو ۔

اس کے بعد آتی ہے سورۃ شوریٰ جس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا مرکزی مضمون " اقامتِ دین " ہے ۔ اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اقامتِ دین کا مضمون یہاں توحید عملی کے اجتماعی تقاضے کے طور پر آیا ہے ۔ گویا اقامتِ دین کے تصور کے بغیر توحید نامکمل ہے ۔

اس لئے کہ توحید کا تقاضا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ حکم کا اختیار، فیصلہ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے ۔ جب اعتقادی طور پر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زمین و آسمان و ما فیہا سب اسی اللہ کے ہیں تو پھر توحید ہی کا تقاضا ہے کہ اس زمین پر صرف اسی کا حکم نافذ ہو ۔ اسی کو فی الواقع اکبر تسلیم کیا جائے ـــــ چنانچہ سورۃ شوریٰ کے پہلے ہی رکوع میں نہایت پرشکوہ اور پرجلال آغاز کے بعد فرمایا : وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (اور تمہیں آپس میں جو بھی اختلاف رونما ہو اس کے فیصلے کا اختیار اللہ ہی کو ہے) ۔

——— اور پھر آیات نمبر ۱۳ تا ۱۵ میں اقامتِ دین کا مضمون پوری صراحت کے ساتھ وارد ہوا۔ فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (اِلٰى) لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ اس آیت میں ایک بات تو یہ واضح کی گئی کہ حضرت آدم سے لے کر حضورؐ تک دین ایک ہی ہے۔ آئینِ خداوندی ہمیشہ سے ایک رہا ہے۔ اور دوسرے اس اہم حقیقت پر روشنی ڈالی گئی کہ دین دیا کس لئے جاتا ہے؟ فرمایا: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ یہ دین اس لئے دیا گیا ہے کہ اسے قائم کرو (یا اگر قائم ہے تو قائم رکھو) اور اس کے بارے میں آپس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ یہ بات مشرکین کے لئے بہت بھاری ہے۔ باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر دینِ حق کا نفاذ، ان کے مفادات کے لئے ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ تو اس کی بھرپور مخالفت کریں گے۔ اسی طرح اہلِ کتاب بھی دینِ حق کے غلبے کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے۔ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ۔ ان کی مخالفت کی دو وجوہات بھی بیان کر دی گئیں۔ ایک ہے بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ۔ یعنی ایک دوسرے پر در ہونے کا برتر ہونے کا جذبہ اور دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۔ کہ یقیناً وہ لوگ جنہیں ہم کتاب کا وارث بناتے ہیں وہ اس کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ بات انہیں حق کو قبول کرنے سے باز رکھتی ہے۔

——— لیکن ان تمام مشکلات کے باوصف حضورؐ کو حکم دیا جا رہا ہے فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ——— اے نبیؐ آپ تو اسی بات کی دعوت دیتے رہئے اور اپنے موقف پر ڈٹ جائیے اور ان مخالفین کی خواہشاتِ نفس کا اتباع نہ کیجئے اور علی الاعلان فرما دیجئے کہ میں تو ایمان رکھتا ہوں اس پر جو نازل کیا ہے اللہ نے کتاب میں سے اور مجھے تو حکم ہے کہ تمہارے مابین نظام عدل قائم کر دوں۔

سورۃ حدید کا میں نے حوالہ دیا تھا۔ وہاں یہ مضمون ان الفاظ میں وارد ہوا کہ: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ وہاں تو رسولوں کو بھیجنے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان یعنی دین

حق نازل کرنے کی غرض وغایت ہی یہ بیان ہوئی کہ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں۔ یعنی دین حق اور نظام عدل کو قائم کریں۔ اس سورۃ یعنی سورۃ شوریٰ میں بھی میزان اور کتاب کے الفاظ ساتھ ساتھ وارد ہوئے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ اور حضورؐ کی زبان سے کہلوا دیا گیا کہ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔ میں تو اس بات پر مامور ہوں کہ تمہارے مابین عدل و قسط پر مبنی نظام قائم کروں سورۃ شوریٰ میں یہ تمام مضمون توحید عملی کے اجتماعی تقاضے کے طور پر سامنے لایا گیا ہے۔

اس لئے کہ اقامتِ دین کے بغیر توحید عملی کا ایک پہلو تشنہ اور ادھورا رہ جاتا ہے اور معاملہ رہتا ہے کہ ؎

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے !!

اس سورۃ کی آیت نمبر ۲۱ میں موضوع کی مناسبت سے مشرکین سے ایک اچھوتا سوال کیا گیا ہے: اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ کہ کیا ان مشرکین کے بھی کچھ ایسے شریک ہیں جنہوں نے از قسم دین کوئی راستہ ان کے لئے نکال لیا ہو جس کا اللہ نے انہیں حکم نہیں دیا ـــــ یعنی دین اور شریعت عطا کرنا، اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور حقیقت ہے کہ کسی لات یا منات نے دین یا شریعت نام کی کوئی چیز آج تک اپنے پیروکاروں کو نہیں دی۔

پھر آیت نمبر ۳۷ تا ۴۳ میں اس جماعت کے اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے جو اقامتِ دین کے مقصد کے لئے قائم ہوئی ہو۔ اس مرحلے کے تقاضوں کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے۔ اس مرحلے پر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سورۃ حم السجدہ میں مقام دعوت کے تقاضے کے ضمن میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ: نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتے۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ وہ اصل میں مقام دعوت تھا اور اس کا تقاضا یہی تھا کہ اگر کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دو۔ لیکن دعوت کے مرحلے کے بعد جب اقامتِ دین کا مرحلہ آتا ہے تو یہاں تقاضے بدل جایا کرتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ہاتھ کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور اینٹ کے جواب میں پتھر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی مرحلے

کے لئے یہ آیت ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔

پھر سورہ کے اختتام پر کے قریب نہایت مؤثر انداز میں دعوتِ عمل دی گئی کہ اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ مَا لَکُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَکُمْ مِّنْ نَّکِیْرٍ۔ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں۔ اس دن تمہارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ رب کی وہ کونسی پکار ہے جس پر لبیک کہنے کا حکم یہاں دیا جا رہا ہے۔ اس سوال کو ذہن میں رکھ کر جب ہم اس سورت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ پوری سورت میں اس سے پہلے صرف ایک بار جمع کے صیغے میں صیغۂ امر وارد ہوا ہے اور وہ مقام ہے اس سورت کی آیت نمبر ۱۳۔ جہاں فرمایا: اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ ۔ "قائم کرو دین کو" ـــــ گویا آیت نمبر ۴۷ میں جس پکار پر لبیک کہنے کی دعوت دی جا رہی ہے وہ پکار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ "دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں آپس میں متفرق نہ ہو جاؤ"۔

اس سورۃ کا اختتام بھی نہایت پرجلال و پرشوکت انداز میں ہوا ہے۔ پہلے وحی اور اس کی اقسام کا بیان ہے اور آخری دو آیات میں خطاب براہِ راست حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ..... الخ

"اور اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک رُوح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے مگر اُس رُوح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر رہے ہو، اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو، سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں"

اور اس طرح اقامت دین کے موضوع پر قرآن حکیم کی یہ عظیم ترین سورۃ اپنے اختتام کو

باقی ص ۴۷ پر)

تحریک اسلامی کا ایک گمشدہ باب
قیام دارالاسلام (پٹھانکوٹ) کی روداد

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ایک تحریر جو انکی وفات کے بعد شائع ہوئی

(بشکریہ ماہنامہ "فاران" کراچی و ہفت روزہ "ایشیا" لاہور)

مرتبہ: جناب محمد یوسف صاحب

الجہاد فی الاسلام کی اشاعت کے بعد مودودی کی زندگی میں ایک عظیم تغیر پیدا ہوا۔ ان کی یہ اولین معرکۃ الآرا تصنیف مولانا محمد علی جوہر کی دلدوز آہ کا نتیجہ تھی۔ سید مودودی نے اس کے بعد اپنی زندگی کلیتہً خدمت اسلام کے لیے وقف کر دی۔ "جمعیت" کی ادارت کو خیرباد کہا چند ماہ بھوپال میں اپنے بڑے بھائی ابو محمد مودودی مرحوم کے ہاں رہے اور یہ پورا عرصہ بھوپال کی سرکاری لائبریری سے استفادے میں گزرا۔ پھر مستقل طور پر حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے۔

۱۹۳۷ء میں سر سالار جنگ کی خواہش پر جنوبی ہند میں تبلیغ اسلام کے لیے ایک سکیم پیش کی جس پر عمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۲ء میں رسالہ "ترجمان القرآن" مولانا ابو محمد مصلح سے لے لیا۔ اور اس کو اپنے مشن کی توسیع و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ اسی ماہنامے کی وساطت سے چودھری نیاز علی خاں مرحوم سید مودودی سے واقف ہوئے اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ علامہ اقبال پہلے ہی الجہاد فی الاسلام کے ذریعہ سید مودودی اور ان کے مشن سے مانوس ہو چکے تھے۔ چودھری نیاز علی جب اقبال سے دوبارہ ملے اور ان کو سید مودودی کے خطوط دکھائے تو علامہ نے مجوزہ دارالاسلام کی سربراہی کے لیے (جس کا دقف نامہ خود علامہ نے تیار کیا تھا) ان سے مراسلت کی ابتداء کی۔ علامہ کی خرابی صحت اور کمزوری بصارت کی وجہ سے یہ خط و

کتابت نذیر نیازی مرحوم کے ذریعے ہوئی۔ سید مودودی نے حضرت علامہ کے خطوط کے جواب میں جو مکتوبات اقبال کو لکھے ان کی نقول سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علامہ سکیم دارالاسلام کی سربراہی کے علاوہ سید مودودی سے اپنی مجوزہ کتاب "عمرانیات اسلامی کی تشکیل جدید" کی ترتیب و تالیف میں نیز قادیانیت کے خلاف بھی کام لینا چاہتے تھے۔ ذیل کے دو فقرے اسی کے غماز ہیں۔

۱ علامہ اقبال کے ساتھ "عمرانیات اسلامی کی تشکیل جدید" میں حصہ لینا میرے لیے موجب سعادت ہے میں ہر ممکن خدمت کیلئے حاضر ہوں مگر اس سلسلے میں کسی مالی معاونہ کی ضرورت نہیں۔

مکتوب مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء

۲ ..... آئندہ رجب کے آخر میں سفر کا ارادہ ہے۔ چار پانچ روز دہلی ٹھہر کر غالباً ختم رجب یا آغاز شعبان میں لاہور پہنچوں گا۔ اس موقع پر یہ بھی طے ہو جائے گا کہ قادیانیت کے متعلق مجھے کیا لکھنا چاہیے۔"

(مکتوب مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۳۷ء)

اس خط و کتابت کے بعد سید مودودی ستمبر ۱۹۳۷ء میں لاہور گئے اور چودھری نیاز علی کے ہمراہ حضرت علامہ سے تین طویل ملاقاتوں میں اسکیم دارالاسلام کے منصوبہ کی تکمیل و صورت گری کی اور پھر ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو مستقل طور پر پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے۔ حضرت علامہ مولانا مرحوم کی لاہور آمد کے لیے بے چینی سے منتظر تھے۔ سید نذیر نیازی سے خط بھی لکھوایا تھا کہ جلد سے پہنچیں۔ سید نذیر نیازی اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ ۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہ نے ان سے دریافت کیا کہ خط کا جواب آیا یا نہیں اور کب مولانا مودودی پہنچ رہے ہیں۔ لفظ میں جواب پا کر وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن ان کے چہرے پر افسردگی کا سایہ صاف نظر آ رہا تھا: اس طلبی کی تصدیق سید مودودی کے تعزیتی خط سے ہوتی ہے جو ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ء کو لکھا گیا۔

"میں اپنے وعدے کے مطابق آنے کی تیاری کر رہا تھا کہ یکایک علامہ کے انتقال کی خبر پہنچی دفعتہً دل بیٹھ گیا۔ سب سے زیادہ رنج مجھے اس بنا پر ہوا کہ کتنا قیمتی موقع میں نے کھو دیا۔ آپ کے عنایت نامہ سے مجھے صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ کہ وقت اس قدر قریب آگیا ہے اگر معلوم ہوتا تو سب کام چھوڑ کر فوراً پہنچتا۔ میں اس کو اپنی انتہائی بدنصیبی سمجھتا ہوں کہ اس شخص کے آخری زیارت سے محروم رہ گیا جس کا مثل شاید اب ہماری آنکھیں نہ دیکھ سکیں .....

..... مجھے جو چیز پنجاب کھینچ کر لائی تھی وہ دراصل اقبال کی ذات تھی میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ ان سے قریب رہ کر ہدایت حاصل کروں گا۔ اب میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اس طوفانی سمندر میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں دلِ شکستگی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ .....

..... برادرم آپ آخری وقت تک علامہ کے ساتھ رہے اگر میری ہدایت کے لیے انہوں نے کچھ فرمایا ہو تو مجھے ضرور اس سے مطلع کریں۔

بالآخر سید مودودی ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو پٹھان کوٹ پہنچے اور سب سے پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ دارالاسلام سکیم کو روبہ عمل لانا تھا۔ چنانچہ ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو وقف کمیٹی کے ارکان کا اجلاس ہوا جس میں سید مودودی نے اپنا وہ تحریری بیان پیش کیا جو ذیل میں دیا جا رہا ہے یہ بیان ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو وقف کمیٹی کے سامنے پڑھا گیا۔ کمیٹی کے حسب ذیل ارکان موجود تھے

۱۔ خان صاحب شیخ محمد نصیب صاحب

۲۔ مولوی رحمت علی صاحب

۳ جناب محمد اسد صاحب (علامہ محمد اسد)

۴ جناب چوہدری نیاز علی خان صاحب

۵ ابوالاعلیٰ مودودی

اس بیان کے ساتھ مولانا کا نوٹ ہے کہ "کمیٹی نے بالاتفاق میری پیش کردہ تین صورتوں میں سے پہلی صورت کو پسند کیا اور مجھ سے خواہش کی کہ اس کے مطابق ریزولیوشن مرتب کردوں تاکہ کمیٹی اسے باقاعدہ منظور کرے چنانچہ میں نے وہ ریزولیوشن مرتب کیا جو اس بیان کے ساتھ منسلک ہے"

یہ ایک نایاب دستاویز ہے جو اس سے قبل منظر عام پر نہ آئی تھی۔

ابوالاعلیٰ

قبل اس کے کہ دارالاسلام کے نظم ونسق کو صحیح اصول پر قائم کرنے اور چلانے کے متعلق میں اپنی تجاویز آپ کے سامنے پیش کردوں، میں چاہتا ہوں کہ اس کی مختصر تاریخ آپ کے سامنے بیان کردوں تاکہ آپ کو معلوم ہوجائے کہ یہ تخیل کس طرح پیدا ہوا، اپنے نشوونما کے کن مراحل سے گزر کر اب کہاں تک پہنچا ہے، اور میں کس خیال کے تحت حیدرآباد سے یہاں آیا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں پانچ سال سے رسالہ ترجمان القرآن شائع کر رہا ہوں اس رسالہ کی اشاعت محض اس غرض سے نہ تھی کہ میں ایک رسالہ نکالنا چاہتا تھا بلکہ دراصل کامل ۱۵ سال تک مسلمانوں کی قومی زندگی سے متعلق رہنے اور ذاتی تجربات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ مطالعہ اور غور وخوض کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کا گرنا اور پیہم رُو بہ زوال ہونا براہ راست نتیجہ ہے اپنی تہذیب کی اصل بنیاد سے ہٹ جانے کا اور اب ان کی اصلاح حال کے لیے بجز اسکے کوئی صورت نہیں ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی کو، فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے، اسی اصل بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس غرض کے لیے میں اس قسم کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ جس کا خاکہ میں ابھی آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوں۔ لیکن ایسے ادارہ کو قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ سب سے پہلے میں وہ خیالات لوگوں میں پھیلاؤں جو میرے قلب ودماغ میں مرتکز ہوچکے ہیں اور جب ایک کافی مدت تک وہ پھیلتے رہیں اور ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ایسے لوگ پیدا ہوجائیں جن کا تخیل اور نصب العین میرے تخیل اور نصب العین سے متحد ہو، تو پھر ان کو ایک مرکز کی طرف دعوت دی جائے اور اس نظام کو وجود میں لایا جائے جسے میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔

اس مقصد کے تحت میں نے ترجمان القرآن شائع کرنا شروع کیا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ میں نے رسالہ جاری نہیں کیا تھا بلکہ دراصل اپنے کام کی مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایک جال پھیلایا

تھا اس کے ساتھ ہی میں نے ایک تجارتی کام بھی شروع کر دیا تھا، تاکہ اپنے پیش نظر مرکز کی تعمیر کے لیے زمین تیار کرنے میں جب تک مجھے کامیابی نصیب ہو اس وقت تک یہ کام فروغ پا کر اس قابل ہو جائے کہ اس کے مرکز کے مصارف سہار سکے اور مجھے کم از کم اس کے قائم کرنے میں کسی سے مدد نہ لینی پڑے۔ کیوں کہ میں اپنے زمانہ کے ذی استطاعت اور صاحب حیثیت مسلمانوں کی ذہنیت کا کافی تجربہ رکھتا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ اگر کسی نیک جذبہ کے تحت بھی یہ لوگ کسی کام پر روپیہ صرف کرتے ہیں تو ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کام کی ہدایت و رہنمائی بھی وہ خود ہی کریں۔ بلا لحاظ اس کے کہ ان میں رہنمائی کی اہلیت ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر میں نے ابتدا سے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس عمارت کو میں اپنے بل بوتے پر خود اپنے نقشہ کے مطابق بناؤں گا اور بعد میں جو لوگ میری مالی مدد کرنا چاہیں گے ان کی مدد واضح طور پر صرف اس شرط کے ساتھ قبول کروں گا کہ وہ تعمیر کے کام میں دخل نہ دیں۔ میں نے اسی نصب العین کے تحت حیدرآباد میں ایک زمین بھی خرید لی تھی، جہاں میں اپنے ادارہ کی عمارت بنانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا اسی دوران میں کہ میں اپنی راہ پر چل رہا تھا، یکایک میرے راستے میں ایک چیز آگئی جس نے بالآخر مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ جناب چودھری نیاز علی خان صاحب کا خط تھا جو اگست ۱۹۳۵ء میں مجھے وصول ہوا۔ اس میں چودھری صاحب نے کسی کار خیر کے لیے ایک معقول جائداد وقف کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا اور مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا کہ اس کو کس کام کے لیے وقف کیا جائے اسکے جواب میں میں نے اپنے وہی خیالات ان کو لکھ کر بھیج دیئے۔ جن کے لیے میں خود کام کر رہا تھا چنانچہ میں نے اپنے ۲۱ اگست ۱۹۳۵ء کے خط میں انہیں لکھا کہ:۔

"صوفیائے اسلام نے قدیم زمانے میں ایک خاص قسم کا ادارہ قائم کیا تھا جو اصحاب الصفہ کے نمونے پر تھا اس کا اصطلاحی نام خانقاہ مشہور ہے آج یہ چیز بگڑ کر اتنی بدنما ہو گئی کہ خانقاہ کا نام سنتے ہی طبیعت اس سے منحرف ہونے لگتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ ایک بہترین انسٹی ٹیوشن تھا جس سے اسلام میں بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس قدیم انسٹی ٹیوشن میں وقت اور زمانے کے لحاظ سے ترمیم کر کے از سر نو جان ڈالی جائے۔ اور ہندوستان میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ایسی قائم کی جائیں جن میں فارغ التحصیل لوگوں کو کچھ عرصہ تک رکھ کر اسلام کے متعلق نہایت صالح لٹریچر کا مطالعہ کرایا جائے اور ان کے ساتھ وہاں ایسا ماحول ہو جس میں زندگی بسر کرنے سے ان کی سیرت خالص اسلامی رنگ میں رنگ جائے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں کلب، لائبریری

اکیڈیمی اور آشرم کی تمام خصوصیات جمع ہونی چاہیں اور اس کا صدر ایسا ہونا چاہیئے جو نہ صرف ایک وسیع النظر اور روشن خیال عالم ہو بلکہ اسکے ساتھ ساتھ ایک سچا اور مکمل عملی مسلمان بھی ہو، تاکہ اس کی صحبت سے خانقاہ کے ارکان کی زندگیاں اسلامی سانچہ میں ڈھل جائیں۔ اس تمام اسکیم کا انحصار شیخ کے انتخاب پر ہے۔ کم از کم معروف اور نمایاں لوگوں میں تو مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں تمام شرائط محقق ہوں۔ اگر آپ اس کام کو کرنا ہی چاہتے ہیں تو ایک مرتبہ ہندوستان کا دورہ کیجیئے شاید کسی گوشہ میں کوئی عالم باعمل آپ کو مل جائے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ چودھری صاحب کا ضمیر بھی وہی چیز مانگ رہا تھا جو میں نے ان کے سامنے پیش کی تھی چنانچہ یہ خیال ان کے دل میں گھر کر گیا، اور اسکے تعاقب میں انہوں نے عمل شروع کر دیا اسکے کئی مہینے بعد ۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو دوسرا خط میرے نام آیا جس میں انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ وقف نامہ رجسٹرڈ کرا دیا گیا ہے اور عمارت کی تیاری بھی شروع ہو گئی ہے لیکن تلاشِ شیخ کے متعلق انہوں نے لکھا کہ :-

"جناب نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں ایسے بزرگ کی تلاش میں ہندوستان کا چکر لگاؤں بھلا ایسی جنس اس طریق پر بھی کہیں مل سکتی ہے ..... اور یہ کام اگر مجھے ہی کرنا ہے تو میں تو آپ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ جناب اس درس گاہ یا خانقاہ کو خود ہی کیوں نہیں سنبھالتے۔ اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" کو اس جگہ جاری رکھیئے۔

اس عنایت نامہ کا جو جواب ۲۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو میں نے دیا، وہ یہ تھا۔

" میرے حالات یہ ہیں کہ میں نے کئی سال قبل وہی اسکیم سوچی تھی جو آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں اس اسکیم کی ابتدا "ترجمان القرآن" کے اجراء سے کی۔ اسکے بعد مالی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے رسالہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک "تجارتی کام" شروع کیا۔ جو اب خدا کے فضل سے کامیابی کے قریب ہے ..... اس میں کامیاب ہونے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ میں خود اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک مختصر جماعت کو منتخب کروں گا اور اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا۔ ایسی صورت میں میرے لیے تو حیدرآباد کو چھوڑنا بہت مشکل ہے اور آپ بھی اس کو پسند نہ فرمائیں گے۔ لیکن مشوروں کی حد تک میں آپ کو ہر قسم کی مدد دینے کے لیے حاضر ہوں۔ اس قسم کے بہت سے

مرکز ہندوستان میں قائم کرنے کی ضرورت ہے اور ان میں اتحادِ مقصد اور اتحادِ خیال کے ساتھ باہمی معاونت بھی ہو تو اس سے بہتر نتائج پیدا ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔"

اس کے بعد یہ سوال تو خارج از بحث ہو گیا کہ میں یہاں آ کر کام کروں گا۔ البتہ اس امر کی ذمہ داری میں نے قبول کی کہ ادارہ کو چلانے کے لیے کام کا نقشہ میں بناؤں گا۔ چنانچہ مختلف اوقات پر میں نے اپنے خطوط میں تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات چودھری صاحب کو لکھتا رہا:۔

۴ ستمبر ۱۹۳۶ء۔

۱۔ سب سے بڑی چیز جس کی اس وقت کمی نظر آ رہی ہے صحیح اسلامی تربیت ہے۔ جدید مدارس تو خیر انگریزی اغراض کے لیے قائم ہوئے ہیں مگر ہمارے قدیم مدارس اور قومی ادارے بھی اس باب میں ناقص ہیں۔ خانقاہ میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جہاں شیخ اور مرید (یہ الفاظ میں مجبوراً ادا کر رہا ہوں۔ اصطلاحی مفہوم مراد نہیں ہے) دونوں اپنی اصلاح کریں، اور ایک دوسرے کی تربیت کریں۔ اور باہر کا جتنا رنگ ہر ایک پر کم یا زیادہ چڑھ گیا ہے، اس کو سب مل کر ایک دوسرے پر سے کھرچیں اور آپس کی معاونت سے ایک دوسرے میں خالص اسلامی سیرت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ وہاں احتسابِ نفس پہلے ہو پھر النصح للہ کے اصول پر عمل کیا جائے اور پھر مداہنت سے پرہیز کیا جائے۔ صحابۂ کرام اور اکابرِ اسلام کی زندگیاں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں اور خصوصیت کے ساتھ ان طریقوں کی پیروی کی جائے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی تربیت فرمائی تھی۔

۲۔ جو اصحاب ادارہ میں داخل ہوں ابتداءً ان کو کم از کم دو سال تک شہری زندگی میں واپس جانے سے روک دیا جائے بلکہ ادارے کی باہر کی دنیا سے ان کا جسمانی تعلق قریب قریب منقطع کر دیا جائے تاکہ اس مدت میں ان پر گہرا رنگ چڑھ جائے۔ اور وہ اتنے پختہ ہو جائیں کہ اگر دوسروں پر اپنا رنگ نہ چڑھا سکیں تو کم از کم دوسروں کا رنگ قبول بھی نہ کریں۔

۳۔ زندگی میں پوری سادگی ہو اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالی جائے جسمانی مشقت کے لیے ایک قطعۂ زمین ایسا مقرر کیا جائے جس میں "شیخ اور مرید" سب اپنے ہاتھوں سے

باغبانی یا ترکاریوں کی کاشت کریں۔ صفائی اور حفظانِ صحت اور تغذیہ کے بالکل جدید ترین اصولوں کی پابندی کی جائے۔ "خذما صفا دع ما کدر" کے اصول پر مغربی زندگی کی تمام وہ چیزیں لی جائیں جو مفید ہوں اور پرہیز صرف ان چیزوں سے کیا جائے جو زہریلی ہوں۔

۴۔ سپاہیانہ فضائل پیدا کرنے کے لیے فوجی ڈسپلن کار فرما اختیار کیا جائے۔ ضبطِ اوقات اور باقاعدہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالی جائے اور اس کے ساتھ ورزشوں میں سے خاص طور پر گھوڑے کی سواری، تلوار کا استعمال، لکڑی کے فنون اور نشانہ بازی کی مشق کا صبح و شام کے اوقات میں التزام کیا جائے۔

۵۔ نماز اور روزے کی سخت پابندی ہونی چاہیے اسکے ساتھ انتہائی کوشش کی جائے کہ ادارہ کا اتباع اور نواہی سے اجتناب کیا جائے اور یہ پابندی شریعت مجبوراً نہ ہو۔ بلکہ بطوعِ و رغبت خود اپنے نفس کے میلان سے ہو۔ ادارہ کی اصل خوبی یہی ہونی چاہیئے کہ وہاں کی آبِ ہوا میں اسلامیت کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ نیکیاں خود بخود نشو و نما پانے لگیں اور شرور و عصیان کے بیج خود بخود جل جائیں۔

۶۔ ادارہ میں سردست صرف اتنے آدمیوں کو شریک کیا جائے جن کو آپ کی جائیداد موقوفہ بآسانی سہارا دے سکتی ہو۔ خواہ ان کا پورا بار وقف پر ہو یا کسی مدت تک وہ اپنا بار آپ سنبھالنے والے ہوں۔ دو تین سال کی تربیت کے بعد ایسا انتظام کیا جائے کہ ادارہ کے ارکان باہم مل کر تجارتی اصول پر کوئی پریس اور دارالاشاعت چلائیں اور نہ صرف اپنا بار خود سنبھالنے کے قابل ہو جائیں۔ بلکہ اپنے ادارے میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنے اور اسی طریق پر ان کی تربیت کرنے کے بھی قابل ہو جائیں۔

۷۔ اگر کوئی شخص برضا و رغبت ادارے کی مالی مدد کرے تو اسے قبول کر لیا جائے لیکن کبھی خود کسی سے مدد نہ مانگی جائے اور نہ عطایا وصول کرنے کو ادارہ کے پروگرام کا ایک شعبہ بنایا جائے۔

۸۔ ادارہ کے تمام لوگ ایسے ہوں جو انگریزی یا عربی درسگاہوں سے فارغ ہو چکے ہوں۔ یا جن کی علمی استعداد اعلیٰ درجہ کی ہو نیز ان میں کوئی ذہانت، کوئی اپج، کوئی جوہر مخفی پایا جاتا ہو۔ ان امور کی تحقیق کے لیے امیدواروں کو ادارہ کا باقاعدہ رکن بنانے سے پہلے دو مہینے کے لیے ادارہ میں بلا کر رکھا جائے اور غیر محسوس طریقہ پر ان کو خوب جانچ کر دیکھا جائے۔

"مولویت" اور فرنگیت سے خصوصاً پرہیز ضرورت ہے۔

۹۔ ادارہ میں باقاعدہ درس و تدریس کی ضرورت نہیں عربی جاننے والے فرداً فرداً انگریزی جاننے والوں کو عربی پڑھائیں اور علوم اسلامیہ کی تعلیم دیں اور اسی طرح انگریزی تعلیم یافتہ حضرات عربی دانوں کو انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی تعلیم دیں ایک وقت ایسا ہو جس میں "شیخ" قرآن کا درس دے یہ درس اس انداز میں ہو کہ شیخ سمیت ہر شخص معلم بھی ہو اور متعلم بھی ہو ہر شخص پہلے سے یہ درس آیات یا آیات کی تفسیر میں کافی غور و خوض اور تحقیق و مطالعہ کر کے شریک درس ہو اور درس کے موقعہ پر اپنی تحقیق بیان کرے۔ اور دوسروں سے استفادہ کرے یہ ایسا جامع درس ہونا چاہیئے کہ اس کے ضمن میں حدیث، فقہ، حکمت اسلامیہ، اصول شرع، فلسفہ، تاریخ اسلامی، غرض دنیا بھر کے مباحث و مسائل آسکتے ہوں۔ درس قرآن کے بعد تمام ارکان کو مطالعہ اور تحقیق میں مشغول ہو جانا چاہیئے۔ یہ کام سب سے زیادہ اہم اور نازک ہے۔ اور شیخ کی "حکمت" کا سب سے بڑا مصرف یہی ہے اور اس کو یہ طے کرنا چاہیئے کہ سردست کن کن شعبوں میں تحقیق کا کام شروع کیا جا سکتا ہے ثانیاً یہ کہ کون کونسے ارکان کس کس شعبے کے لیے موزوں ہیں۔ ثالثاً یہ کہ ان کی راہنمائی کس ڈھنگ سے کی جائے اور ہر شعبہ میں تحقیق کی لائن اور اس کا نصب العین کیا ہو۔

میری رائے میں سردست تین چار شعبے خاص طور پر توجہ کے محتاج ہیں۔

۱ فقہ۔

۲ معاشیات۔

۳ علوم عمران۔

۴ فلسفہ اور نظری سائنس۔

یہ سب علمی اور تحقیقی کام اس بنیادی نظریہ کے ساتھ کیا جائے کہ قرآن و سنت ہی علم کا اصل منبع ہے سب کچھ ہم کو اس سے لینا ہے اور اس نظام شمسی میں ہر چیز کو اسی آفتاب کے گرد گھومنا ہے اس مرکز سے منحرف جو چیز ہو اسکے لیے اس نظام میں کوئی جگہ نہیں۔

۱۰۔ ادارہ کی تعلیم و تربیت سے جب ایک جماعت پوری طرح تیار ہو جائے تو اشاعت کا کام شروع کیا جائے۔ اشاعت کے لیے تین زبانوں کا انتخاب میری رائے میں مناسب ہے۔ عربی انگریزی اور اردو۔ اشاعت زیادہ تر رسالوں اور کتابوں کی شکل میں ہونی چاہیے اسکے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خیالات اور عملی طریقوں کی اصلاح کے لیے "ٹریکٹس" کی اشاعت بھی شروع

کی جائے۔ جدید نیم مختار کونسلوں سے مجھے ایک نقشہ اٹھتا نظر آتا ہے بحیثیت جہلاء مسلمانوں کی طرف سے نمائندے بن کر کونسلوں میں جائیں گے اور سوشل ریفارم کے نام سے "سوشل ڈیفام" کریں گے اور جدید قوانین بنا کر مسلمانوں کے مرپرسنل لاء کو اور زیادہ مسخ کریں گے اس وقت علماء کے شور و غل مچانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیوں کہ یہ لوگ چھ سو برس پہلے کی دنیا میں رہتے ہیں ایسے موقع پر صرف ماڈرن علماء ہی کام آسکیں گے وہ اس زمانے کی زبان میں اسلامی قوانین کی صحیح تعبیر پیش کریں گے، اور قانون سازوں کو بتائیں گے کہ سوشل ریفارم کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کونسی ہے۔"

"۱۳ محرم ۱۳۵۶ھ ۲۶ مارچ ۱۹۳۷ء"

یہ کام بالکل نیا ہے اور ماضی و حال دونوں میں اسکے لیے پہلے سے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے اس لیے نتیجہ کہ اکثر لوگ مشکوک ہی پائیں گے اور خود آپ کو بھی اس کے لیے صحیح راستہ متعین کرنے میں دقتیں پیش آئیں گی مگر چوں کہ مقصود بالکل واضح طور پر ہمارے سامنے متعین ہو چکا ہے۔ اس لیے تمام مشکلات کے باوجود سیدھا راستہ ہم کو ضرور مل جائے گا۔

ہم خالص قرآن کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ جدیدہ Renaissance چاہتے ہیں۔ قرآن کی اسپرٹ اور اسلام کے اصول ہمارے نزدیک غیر متبدل ہیں مگر افکار اور معلومات کی ترتیب اور عملی زندگی کے احوال پر اس روح اور ان اصولوں کا انطباق ہمیشہ احوال کے تغیر اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلنا ضروری ہے متقدمین اسلام اس چیز کو سمجھتے تھے انہوں نے اپنے زمانے میں عملاً اسکو برتا۔ مگر متاخرین یہ سمجھے کہ اصول اور اسپرٹ کی طرح ان کا انطباق بھی غیر متبدل ہے اسی چیز نے وہ جمود پیدا کیا جو سات سو برس پہلے سے ہمارے علوم اور ہمارے قوانین حیات پر طاری ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے اس جمود کو توڑنا چاہا، مگر انہوں نے جو نشاۃ جدیدہ پیدا کرنا چاہی وہ اسلام کی نشاۃ جدیدہ نہیں ہے اس لیے کہ وہ روح قرآنی اور اصول اسلامی سے بے بہرہ ہیں ان کی فکر و نظر اسلامی نہیں ہے اس لیے نہ وہ مسلمانوں کی حیثیت سے سوچ سکتے ہیں نہ اسلامی طریق پر معلومات کو مرتب کر سکتے ہیں نہ زندگی کے معاملات کو مسلمان کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں ہمارا راستہ متاخرین اور متقدمین دونوں کے راستے سے الگ ہے ہمیں ایک طرف روح قرآنی کو ٹھیک ٹھیک اپنے اندر جذب کرنا ہے اور اپنی قوت فکر و نظر کو اصول اسلامی سے پوری طرح مستحد

(IDENTIFY) کرنا ہے۔ دوسری طرف علم کی اُن ترقیات اور احوال کے ان تغیرات کا پورا پورا جائزہ لینا ہے جو گذشتہ آٹھ سو برس کی مدت میں ہوئی ہیں۔ اور تیسری طرف اسلامی طریق پر افکار و معلومات کو مرتب، اور قوانین حیات کو مدون کرنا ہے تاکہ اسلام پھر سے بالفعل ایک قوت (DYNAMIC FORCE) بن جائے اور دنیا میں مقتدی بننے کی بجائے مقتدا اور امام بن کر رہے۔

یہ ایک (Herculean Task) ہے اول تو ہم اسکو اسطرح شروع کرتے ہیں کہ ہم سے پہلے کوئی اسکے نشانات راہ چھوڑ کر نہیں گیا ہے ہمیں خود ہی اپنی منزل مقصود کو پیش نظر رکھ کر راستہ بنانا ہے اور اسپر چلنا ہے دوسرے یہ اتنا بڑا کام ہے کہ میری اور آپکی اور ہم جیسے سینکڑوں آدمیوں کی پوری پوری زندگیاں بھی اسکے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگر ہم یہ امید کریں کہ ہماری زندگی میں اس کے پورے نتائج سامنے آجائیں گے تو یہ غلط امید ہوگی۔ یہ کھجور کا درخت لگانا ہے جو اسکو بوتا ہے وہ اس کے پھل نہیں توڑ سکتا۔ ہم اس درخت کو لگائیں گے اور اپنے خون جگر سے اسکو سینچ کر چلے جائیں گے۔ ہمارے بعد دوسری نسل آئے گی۔ اور شاید وہ بھی اس کے پھلوں سے پوری طرح لذت آشنا نہ ہو سکے گی۔ کم از کم دو تین پشتیں اسکے پورے نتائج ظاہر ہونے کے لیے درکار ہیں۔ لہذا ہمیں نتائج کے لیے بے صبر نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ عمارت کا نقشہ ٹھیک ٹھیک جیسا کہ ہم بنا سکتے ہیں بنا دیں اور اس کی بنیادیں اٹھا کر نئی آنے والی نسل کو تعمیر کا کام جاری رکھنے کیلئے تیار کر دیں اس سے زیادہ غالباً ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔

ائمہ مساجد کی تعلیم و تربیت کے متعلق بھی اپنے خیالات عرض کر دوں۔

اسلام کے جتنے انسٹی ٹیوشن ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم اقدم مسجد ہے جس کی کامیابی امام کی قابلیت پر منحصر ہے مگر شاید سب سے زیادہ (Degeneration) اسی انسٹی ٹیوشن میں ہوا ہے اب امام کا مفہوم مسلمانوں کے ذہن میں یہ رہ گیا ہے کہ جو شخص کسی کام کے قابل نہ ہے وہ امامت کے قابل ہے۔ اور اسی کو امامت کرنی چاہیئے حالاں کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے امام ہی کو سب سے زیادہ قابل ہونا چاہیئے ..... سر دست عملاً اتنا عرض کرتا ہوں کہ اچھے اور تعلیم یافتہ اور عمدہ کیرکٹر کے اور کافی سن رسیدہ آدمیوں کا انتخاب کیجیے۔ مجردوں کی بہ نسبت شادی شدہ آدمی قابل ترجیح ہیں سب سے زیادہ جو چیز ان کے

ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ امام کی صحیح حیثیت ہے امام اپنی مسجد کے حلقہ اثر میں اسلام کا نمائندہ ہے اس کے اخلاق اور اس کی سیرت کو نہایت پاکیزہ ہونا چاہیے ایک معمولی درجہ کی دنائت یا ناشائستگی بھی اگر اس سے سرزد ہو تو غیروں کی نظر ہی میں نہیں، خود مسلمانوں کی نظر میں بھی اسلام کی وقعت گر جاتی ہے حتی کہ لوگوں کے ایمان تک خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کو اپنی زندگی ایسی بنانی چاہیے کہ گویا وہ زندہ اور چلتا پھرتا اسلام ہے۔ دلوں میں اس کی عزت اور محبت جاگزیں ہونی چاہیے اور اسکی شخصیت میں کشش ہونی چاہیے وہ خود بخود اپنی بستی کا مرکز بن جائے اور اپنی مقناطیسیت سے مسجدوں کو اسلامی آبادی کا مرکز بنا دے۔ امام کا خوش آواز ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ قرآن کو دلکش طریق سے پڑھ سکے اس میں خطابت کی قابلیت بھی ضروری ہے تاکہ جمعہ کا خطبہ برجستہ دے سکے اس کا مطالعہ کافی وسیع ہونا چاہیئے نہ صرف احکام اسلامی سے خوب واقف ہو بلکہ عام معلومات بھی اسے حاصل ہوں اور ایک حد تک "لیڈرشپ" کی اچھی صلاحیتیں اسکے اندر موجود ہوں۔ فرقہ بندی میں اسکو غلو نہ ہو۔ اسے وسیع الخیال اور وقت اور زمانہ کا مزاج شناس ہونا چاہیئے ان سب باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے ادارہ سے جو لوگ تربیت پاکر جائیں وہ بعد میں بھی مرکز سے متعلق رہیں، اور اپنی اپنی بستیوں کے ایسے معاملات میں مشورہ و ہدایت کے لیے مرکز کی طرف رجوع کرتے رہیں جن میں کسی قسم کی اہمیت ہو۔"

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ابتداءً میرے پیش نظر کیا اسکیم تھی میں چاہتا تھا کہ اس قسم کا ایک ادارہ میں خود حیدرآباد میں قائم کروں اور اس قسم کا ایک ادارہ یہاں قائم کیا جائے جس کو کوئی موزوں و مناسب قسم آدمی انہی لائینز پر چلاتا رہے۔

اس کے بعد حالات نے دفعتہً پلٹا کھایا۔ مسلمانوں کی قومی طاقت کے روز افزوں زوال اور ان کے انتشار فکر و عمل سے جس چیز کا خطرہ مجھے ایک مدت سے تھا، میری توقع کے خلاف، حالات کی رفتار اسکو یکایک سامنے لے آئی۔ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں اس خطرہ کے آثار و علائم بڑی تیزی کے ساتھ مجھ کو نظر آنا شروع ہوئے یہاں تک کہ مارچ مذکورہ میں جب میں دہلی گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سیاسی حالات کے تغیر سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو حالات کی حقیقی نوعیت کو سمجھ کر انہیں آنے والی تباہی سے بچانے کی کوئی صحیح اسلامی راہ پیش کرے، تو مجبوراً میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس قدر بھی طاقت خدا نے مجھے دی ہے اسکو اسی انقلاب کے مقابلے

میں صرف کر دوں کیوں کہ اگر اس قوم کو خراب کر دیا تو پھر کسی تعمیری کام کے لیے کوئی موقعہ ہی باقی نہ رہے گا چنانچہ میں نے دہلی سے حیدرآباد پہنچتے ہی اس نئی مہم کی ابتدا کر دی جس کے ابتدائی نشانات میرے ان مضامین میں ملتے ہیں جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں اسکے متعلق میں نے ۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء کے خط میں چودھری صاحب کو لکھا تھا کہ:-

"اب میرے سامنے ایک بڑی مہم درپیش ہے جس میں مجھے ہمہ تن منہمک ہونا پڑے گا۔ میں نے اس مہم کی ابتدا محرم کے ترجمان القرآن سے کر دی ہے جس میں اسلامی ہند کے مستقبل پر مضامین کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ آئندہ چند مہینوں میں دیکھنا ہے کہ کتنے مددگار ملتے ہیں۔ بہرحال میں یہ تصفیہ کر چکا ہوں کہ خواہ سارے ہندوستان میں ایک بھی ساتھی نہ ملے، میں تنہا اپنی ذات سے اس جنگ کو شروع کر دوں گا، اور آخری وقت تک جاری رکھوں گا قطع نظر اسکے کہ کامیابی ہو نہ ہو مسلمانوں کی اسوقت جو نازک حالت ہے اور جو خطرناک مستقبل ان کے سامنے ہے اس کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ آئندہ دس بیس سال اس ملک میں اسلام کی قسمت کیلئے فیصلہ کن ہیں اگر اس وقت ہم مدافعت کے لیے کھڑے نہ ہوئے تو چند سال بعد ہم کو سکون کا کوئی گوشہ نہ ملے گا جہاں بیٹھ کر ہم کوئی تعمیری کام کر سکیں۔ آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے جس نے مجھے پرسکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے آگ اپنے سینے میں لایا ہوں۔ اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔؟"

اس مہم کو شروع کرنے کے بعد میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اب میرے لیے حیدرآباد کوئی مناسب مقام نہیں ہے پہلے جو خالص تعمیری کام میں کرنا چاہتا تھا اسکے لیے ایک ایسے گوشۂ عافیت کی ضرورت تھی جو ہنگاموں کی دنیا سے دور ہو۔ حیدرآباد اسکے لیے بہترین گوشۂ عافیت مجھے دے سکتا تھا۔ لیکن جب مجھے انقلابی طاقتوں کے مقابلے میں تنازع للبقاء کے لیے اٹھنا پڑا تو میرے لیے ناگزیر ہو گیا کہ گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر اصل میدانِ مقابلہ میں جاؤں چنانچہ میں نے ۲ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں اس کے متعلق چودھری صاحب کو لکھا۔

"میں اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اصل میدان مقابلہ شمالی ہندوستان ہے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ وہیں ہوگا اور اسی فیصلہ کے اثرات سارے ہندوستان میں پھیلیں گے لہٰذا اب میرے لیے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہاں سے ہجرت کروں اور شمالی ہند میں کسی جگہ قیام کروں لیکن دارالہجرت کے انتخاب میں ابھی متردد ہوں۔ محرم کے اشارات

شائع ہونے کے بعد سے بکثرت خطوط آرہے ہیں جن میں مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ کوئی راہِ عمل تجویز کروں۔ میں بے صبری کے ساتھ کام کرنے کا قائل نہیں۔ پورے غور وخوض کے ساتھ ایک "نقشۂ جنگ" بنا رہا ہوں۔ انشاء اللہ دو تین مہینے میں یہ نقشہ مکمل ہو جائے گا اسکو شائع کرنے کے بعد من انصاری الی اللہ کی آواز بلند کروں گا، اور صرف ایسے لوگوں کو دعوت دوں گا جو وقت آنے پر یہ نہ کہہ دیں کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔"

خود چودہری صاحب نے بھی اس چیز کو اپنی جگہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ وہ اپنے ۲۵ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"جو خیر و شر ہندوستان میں پہنچا ہے اس کی بیش رو ی کا بوجھ پنجاب کے ذمہ ہی ہونا ہے۔ آپ اپنا مورچہ یہاں آکر لگائیں۔ جس انقلاب کے خطرے سے آپ نے آگاہی کی ہے وہ یہاں ہی سے اٹھے گا۔ اگر آپ نے پنجاب کو دبا لیا تو پھر سارے ہندوستان کو دبا لیا۔ اس بات پر غور فرمائیں اور ایک ماہرِ فن جرنیل کی طرح محاذ اچھی جگہ قائم کریں۔"

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں خود ہی شمالی ہندوستان کی طرف منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی میں ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف میرا ۲۰ سال کا غور وخوض اور مطالعہ تھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بنیاد کو مضبوط کرنے کے لیے اس تعمیری کام کے سوا کوئی دوسری چیز کارگر نہیں ہو سکتی جس کا نقشہ میں بنا چکا ہوں دوسری طرف مسلمانوں کے پراگندہ گرد پیر انقلاب کی تو چلک تیزی کیساتھ تاخت کر رہی تھی جس سے دیکھ کر میں سمجھ رہا تھا کہ اب بلا تاخیر اپنی بچی کھچی قومی طاقت کو سنبھالنا ضروری ہے۔ ورنہ جتنی دیر ہم اپنے تعمیری کام کو اس حد تک ترقی دے سکیں گے کہ وہ قوم کو سنبھالنے کے قابل ہو، اتنی دیر میں قوم ختم ہو جائے گی۔ اگر تعمیری کام کا وہ نقشہ آپ کے سامنے ہے جو ابھی میں بیان کر چکا ہوں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ چند آدمیوں کا قرآن وسنّت اور علوم قدیمہ وجدیدہ کے عمیق مجتہدانہ مطالعہ اور خالص اسلامی تربیت سے باعتبار علم اور باعتبار مضبوطیٔ سیرت اس قابل ہو تاکہ وہ قوم کے بگڑے ہوئے نظامِ تعلیم و تربیت اخلاق کو درست کریں اور پھر اس اصلاح شدہ نظامِ تعلیم و تربیت سے قوم میں ایسی طاقت پیدا ہو تاکہ وہ سیاسی معاشی تمدنی اور اخلاقی پستی سے ابھر سکے۔ یہ کتنی طویل مدت چاہتا ہے کم سے کم اندازہ کے مطابق اگر اسکو آج شروع کیا جائے تو یہ تیسری پشت (Generation) میں جا کر بار آور ہوگا۔ اب آپ خود ہی مجھے بتائیں کہ جو طوفان ہمارے سر پر آگیا ہے کیا وہ ہمیں اتنی فرصت دینے کے لیے تیار ہے کہ ہم اس

طرح اطمینان سے بیٹھے ہوئے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو از سر نو تیار کریں۔؟ جو حالات آپکے سامنے بھی ہیں اور میرے سامنے بھی ہیں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے جسے میں دیکھتا ہوں اور آپ نہ دیکھتے ہوں ایک طرف ایک منظم طاقت ہے جو نیشنلزم اور ڈیماکریسی کے مجموعے کو پراونشل اٹانومی کے زبردست وسائل سے ہندوستان جدید کی تعمیر اس نقشہ پر شروع ہو چکی ہے جس میں مسلمان قوم کے لئے بحیثیت مسلمان قوم ہونے کے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف مسلمان ایک ریوڑ کی طرح ہندوستان کے طول و عرض میں بھٹک رہے ہیں اور ان کی بے شمار ٹکڑیاں، بے شمار راستوں پر بھاگتی چلی جا رہی ہیں میں انتہائی رجائیت (OPTIMISM) کے ساتھ اگر اندازہ لگاؤں تو کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ دس سال یہ حالت قائم رہی تو میدان کلی طور پر آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ قوم ہی باقی نہ رہے گی جس کو سنبھالنے کے لیے آپ بیٹھے ہوئے درس قرآن دیا کریں گے بلکہ وہ شاید گوشہ عافیت بھی آپ کو نہ ملے گا جہاں بیٹھ کر آپ ایسا درس قرآن دے سکیں جس میں دشمنان اسلام کو اسلامی طاقت کے اعادہ (REVIVAL) کا خطرہ نظر آئے یہی خیالات تھے جن میں اب سے دس مہینے پہلے ڈوبا ہوا تھا آخر کار شدید غور و فکر کے بعد اس فیصلہ پر پہنچا کہ خواہ میری مشکلات کتنی ہی بڑھ جائیں اور مجھ پر ذمہ داریوں کا بوجھ کتنا ہی ناقابل تحمل ہو جائے، بہر حال مجھ کو سیاسی جدوجہد اور قومی تعمیر کے دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے چاہییں تاکہ میدان جو تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، سیاسی جدوجہد سے اسکو بچایا جائے اور پھر جتنا میدان ہاتھ آئے اسکو قابو میں رکھنے کے لیے تعمیری کام کے ذریعہ قوم کو تیار کیا جاتا رہے میں اس فیصلہ پر اس لیے بھی مجبور تھا کہ جب میں نے اپنے سیاسی مضامین کے ذریعے قوم میں ایک آگ بھڑکا دی، اور اس کو کانگریس اور لیگ کے درمیان ایک دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرا دی تو اسکے ساتھ ہی مجھ پر اخلاقی فرض عائد ہو گیا کہ میں ہی وہ دوسرا راستہ بنا کر بھی دکھاؤں اور اسپر چلا کر عملاً ثابت کر دوں کہ یہی نجات کا راستہ ہے۔ اس موقعہ پر میرا پیچھے ہٹنا یہ معنی رکھتا ہے کہ میں اپنی قوم سے غداری کر رہا ہوں اور اسکو اکسانے کے بعد ایسی جگہ لے جا کر چھوڑ رہا ہوں جہاں وہ پیاس تو شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے مگر پانی موجود نہیں ہے یہ بات صرف یہیں تک نہیں رہی ہے کہ میرا ایسا خیال ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے جو خطوط میرے پاس آئے ہیں ان کے بنڈل دیکھنے کی زحمت اگر آپ گوارا فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ملک کے جن حلقوں تک میری آواز پہنچی ہے، وہ مجھ سے کس چیز کی توقع رکھتے ہیں۔ کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور اگر میں نے اسکو پورا کرنے میں کوتاہی کی تو وہ مجھے کس نظر سے دیکھیں گے۔ رہی وہ جوابدہی جو مجھے خدا کے ہاں کرنی پڑے گی اس میں تو ظاہر ہے کہ میرا کوئی شریک

حال نہیں ہو سکتا۔ بہرحال چوں کہ آپ میری پوزیشن میں نہیں ہیں اسلیئے میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو اس ذمہ داری کا کہاں تک اندازہ ہے جو اس وقت مجھ پر عائد ہو گئی ہے لیکن میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ مجھ پر اس ذمہ داری کا احساس اتنا سخت ہے کہ اسکے تقاضے کو پورا کرنے میں خواہ مجھ کو کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے، خواہ میری بربادی کیوں نہ ہو جائے اور خواہ مجھے اپنے عزیز ترین تعلقات ہی کو کیوں نہ قربان کرنا پڑے، میں کسی خوف یا کسی لالچ، یا کسی تعلق کی خاطر اس سے ہٹ نہیں سکتا۔ نہ کسی کو مجھ سے اس کی توقع رکھنی چاہیئے۔ اور نہ میں کسی ایسے شخص یا گروہ سے تعاون کر سکتا ہوں جس سے تعاون کرنے کے لیے مجھے اپنے اس راستے سے ہٹنا پڑے۔

یہ فیصلہ تھا جس کی اطلاع میں نے اپنے ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کے خط میں چودھری صاحب کو دی اس خط کے الفاظ یہ ہیں۔

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے میری اسکیم یہی تھی کہ خاموشی کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھ کر کام کے آدمی تیار کیے جائیں اور پھر ان سے کوئی بڑا کام لیا جائے لیکن یہ کام دیر طلب ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ انقلاب سر پر آگیا ہے اگر اس وقت مسلمانوں میں کوئی زندگی پیدا نہ کی گئی تو پوری جماعت ڈوب جائے گی اور جب پوری جماعت ڈوب گئی تو ہمارا اور آپ کا کہیں ٹھکانہ ہی نہ ہوگا کہ تعمیری کام کر سکیں۔ ایک طرف تو یہ پہلو ہے دوسری طرف یہ حقیقت بجائے خود قائم ہے کہ محض سطحی تحریک سے کوئی پائیدار فائدہ نہ ہوگا تعمیری کام بہرحال ضروری ہے اور تعمیری کام یہی ہے کہ ایک باایمان اور فعال جماعت تیار کیجائے جو پوری قوم بنانے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اب یہ مشکل آپڑی ہے کہ وقت پہلے کام کا مطالبہ کر رہا ہے جس کے لیے فوری عمل کی ضرورت ہے اور حکمت دوسرے کام کی متقاضی ہے جو تدریجی تعمیر چاہتا ہے۔

میں کئی مہینے سے اسی فکر میں مبتلا ہوں کہ کیا کروں؟ بالآخر اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجھ ہی کو یہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے چاہئیں۔ پہلے کام کے لیے میں مخلص، پُرجوش اور باعمل نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہوں جو ہماری قوم کے عوام میں جائیں اور ان کے اندر بیداری پیدا کریں اس کا مرکز شمالی ہند کا کوئی مناسب مقام ہوگا۔ رہا دوسرا کام تو اس کے لیے آپ کے ادارہ کو مرکز بنایا جائے گا اور یہاں ایک نہایت گہری اور پائیدار بنیاد پر تعمیری کام کرنے کے لیے اہل علم کی ایک جماعت تیار کیجائے

گی. میں ان دونوں کاموں سے اپنا تعلق رکھوں گا، اور کسی ایسی جگہ ہجرت کر جاؤں گا جہاں سے یہ دونوں تحریکیں بآسانی چلائی جا سکیں۔

جیسا کہ میں نے اپنے اس خط میں لکھا ہے۔ اس وقت میری رائے تھی کہ میں ہیڈکوارٹر کسی دوسرے مقام کو بناؤں تاکہ وہاں آزادی کے ساتھ اپنے نقشہ کے مطابق سیاسی تحریک کی ابتدا کر سکوں لیکن وہ ہیڈکوارٹر اس مقام سے قریب ہوتا کہ یہاں جو تعمیر کا کام شروع کیا جائے اس سے میرا تعلق قائم رہے یہ رائے میں نے دو وجوہ سے قائم کی تھی ایک یہ کہ میں آپ حضرات کی نازک پوزیشن کو سمجھتا تھا اور مجھے نہ صرف اس بات کا خیال تھا کہ آپ کے لیے کسی ایسی تحریک سے فوراً تعلق رکھنا مشکل ہے جو کبھی حکومتِ وقت کی پسندیدگی سے محروم بھی ہو سکتی ہے بلکہ میں خود بھی آپ کو اپنے ساتھ ایسی ذمہ داری میں باندھنا پسند نہیں کرتا تھا جو کسی وقت آپ کے لیے ناقابل تحمل ہو جائے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ذاتی واقفیت اور تحقیق حال کے بغیر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کے ساتھ میرا تعاون ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کا نقشہ میں نے سوچا ہے جس کی تعمیر مجھ کو کرنی ہے۔ جس کا مجھ کو دنیا میں ساری قوم کے سامنے، اور آخرت میں خدا کے سامنے جواب دینا ہے اسکے بنانے اور چلانے میں مجھ کو پوری آزادی فکر و عمل حاصل ہونی چاہیئے۔ ذمہ دار بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کس طرح ادا کرے۔ انجینئر جس کو عمارت بنانی ہے خود بہتر طریقے سے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ بنیادیں کس طرح کھودے، اور دیواریں کس طرح اٹھائے۔ اگر نقشہ بنانے اور عمارت اٹھانے کی ذمہ داری الگ الگ ہو اور ایک ایک اینٹ کے متعلق یہ فیصلہ کرنے والے دوسرے ہوں کہ وہ رکھی جائے یا نہ رکھی اور اگر رکھی جائے تو کب اور کہاں رکھی جائے۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں کوئی عمارت بننی ممکن ہی نہیں۔ اور اگر کوئی عمارت بنانا ہو تو خود اس کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ ایسی مداخلت سے باز رہے۔

بس میں تحقیق کے بغیر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں مجھ کو ایسی آزادی حاصل ہوگی یا نہیں؟ گو مجھکو ایسے مددگاروں کی یقیناً ضرورت ہے جو اس عمارت کی تعمیر کا سامان فراہم کریں۔ مگر ایسے مددگاروں سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو سامان اس شرط کے ساتھ فراہم کریں کہ نقشہ عمارت اور تعمیر عمارت میں ان کی رائے فیصلہ کن ہوگی۔ درآنحالیکہ عمارت بگڑنے سے قوم کے سامنے اور خدا کے سامنے ان کا نہیں، بلکہ میرا منہ کالا ہوگا۔

بہرحال ان وجوہ سے میں یہاں آنے کا فیصلہ کرنے میں تامل کر رہا تھا مگر جب اکتوبر ۱۹۳۶ء

میں دہلی گیا۔ تو چودھری نیاز علی خاں صاحب از راہ کرم میرے پاس دہلی تشریف لائے اور پھر ان کے ساتھ میں یہاں حاضر ہوا اور یہاں سے لاہور جا کر علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس تمام سفر کے دوران میں نے اپنے خیالات اور ارادوں سے چودھری صاحب کو پوری طرح آگاہ کر دیا اور جب ان سب سے واقف ہونے کے بعد انہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی اور یقین دلایا کہ اپنی سکیم کو عملی جامہ پہنانے میں مجھ کو پوری آزادی حاصل ہوگی۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنا ہیڈ کوارٹر الگ بنانے کی ضرورت نہیں ہے اور یہی جگہ دونوں کاموں کا مرکز ہو۔ اس فیصلہ کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں منتقل ہو کر آیا ہوں آپ جانتے ہیں کہ اس انتقالِ مکانی میں جو کچھ مالی بار مجھ پر پڑا ہے وہ میں نے خود برداشت کیا ہے یہاں رہنے کے لیے اور اپنا پرچہ چلانے کے لیے جتنے مصارف کی ضرورت ہوگی وہ میں خود برداشت کروں گا۔ حتیٰ کہ جب تک میں زمین لے کر اپنا مکان بناؤں اس وقت تک میں وقف کے جس مکان میں رہوں گا اس کا کرایہ بھی وقف کمیٹی کو دوں گا۔ اور انشاء اللہ ایک جبہ کسی وقت آپ کی کمیٹی سے یا آپ میں سے کسی صاحب سے اپنی ذات یا اپنے رسالے کے لیے نہ لوں گا اس کے بعد ظاہر ہے کہ اخلاقاً بھی مجھ پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ہے جس کی بنا پر یہاں وہ پوزیشن قبول کروں جو کسی پرائیویٹ درسگاہ کے تنخواہ دار ہیڈ ماسٹر کی ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ حقیقی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر آپ خود بھی ایسی توقع مجھ سے نہ رکھیں گے۔

اب اپنی تجاویز پیش کرنے سے پہلے میں ایک فقرے میں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اولین مسئلہ جس کا آپ کو فیصلہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ عمارت میں اپنے نقشہ پر بناؤں تو مجھے کامل اختیارات دیجیے اور اگر آپ خود بنانے کا خیال رکھتے ہیں تو مجھ سے اب بھی صاف کہہ دیجیے تاکہ میں واپس چلا جاؤں کیوں کہ میں واپس جانے کا نقصان گوارا کر سکتا ہوں۔ مگر یہ بات میرے لیے ناقابلِ تحمل ہوگی کہ آپ ہر مرحلہ پر یہ فرمائیں کہ پہلے فلاں کام کرو، اور فلاں نہ کرو۔ اور ہم فلاں کام کرنا چاہتے ہیں اور فلاں نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے سخت طوفان کی حالت میں ایک طرف ٹوٹی ہوئی کشتی کو بچانے کی فکر ہے اور دوسری طرف نئی کشتی بنانے کی۔ اس کام میں گرد و پیش کے حالات کی رفتار، مستقبل کے امکانات، مسلمانوں کی مزاجی کیفیت اور اس کے اتار چڑھاؤ، وقت کی ضروریات، اپنے ذرائع و وسائل اور ممکن الحصول رفتارِ کار کی صلاحیت، غرض ان سب چیزوں پر تفصیلی نظر رکھ کر مجھ کو انتہائی جگر سوزی و دماغ کاوی کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھانا ہے اور ایسے اندھیرے میں اٹھانا ہے جس میں بجز اپنے دل کی روشنی کے کوئی شعاع تک مجھ کو باہر کی دنیا میں نظر

نہیں آتی۔ ایک ایک قدم جو میں اٹھاتا ہوں اسکے اٹھانے کا فیصلہ کرنے اور دوسرے قدم کا رخ متعین کرنے میں مجھے کتنا خون جگر کھپانا پڑتا ہے اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اب اگر کوئی صاحب جن پر نہ اس ذمہ داری کا کوئی بوجھ ہے اور نہ جنہوں نے اس کام کا نقشہ بنایا ہے، میرے راستے میں آکر بیک جنبش زبان حکم صادر فرمادیں کہ اس سمت میں قدم اٹھایا جائے اور فلاں کام پہلے شروع کیا جائے اور فلاں کام کا سلسلہ ابھی شروع نہ ہو تو نہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں اور نہ کہنے والے صاحب اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ ذرا سی بات جو انہوں نے بے تکلف فرمادی، اس سے میری کتنی محنت پر پانی پھر گیا اور میرے قائم کئے ہوئے توازن میں کتنی برہمی و پراگندگی واقع ہو گئی اسکو اگر کوئی اعانت سمجھتا ہو تو میں ایسی اعانت سے باز آیا۔ مجھے معاونین کی تو بلاشبہ ضرورت ہے لیکن ایسے معاونین کی نہیں کہ ادھر مجھے طوفان سے لڑنا ہو اور ادھر میرے معاونین میرے ہاتھ پاؤں کتے رہیں اگر کوئی صاحب یہ خیال رکھتے ہوں کہ وہ خود اس کام کے نشیب و فراز کو بہتر سمجھتے ہیں اور اسکے چلانے کی پوری اہلیت ان میں ہے تو وہ خود اس ذمہ داری کو قبول فرمائیں۔ ایسی صورت میں میں نہیں سمجھتا کہ میری کیا ضرورت ہے۔

یہ سوال جو میں نے آپکے سامنے بلا کسی رو رعایت اور ناک پیٹ کے پیش کیا ہے اس کا فیصلہ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی بلا کسی رو رعایت کے کریں اور اگر آپ تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد، جو میں نے آپکے سامنے پیش کی ہیں یہ سمجھیں کہ فی الواقع ایسی صورت میں میری یہاں ضرورت نہیں ہے تو میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اس کے اظہار میں غلط مروت سے کام نہ لیں۔ اور اس بات کی ذرہ برابر فکر نہ کریں کہ مجھے یہاں سے اٹھ کر جانے میں زحمت ہوگی۔ اس راستے میں قدم اٹھانے سے پہلے ہی میں اس سے ہزار گنی زیادہ زحمتوں کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکا ہوں اور میرے نزدیک اس چھوٹی سی زحمت کا اس وقت اٹھالینا اس سے بہتر ہے کہ بعد میں ہر ہر قدم پر مجھے روحانی اذیتیں پہنچیں اور بعد از خرابیٔ بسیار اس چیز کا فیصلہ کروں جس کو آج بخوشی عمل میں لا سکتا ہوں۔

اب میں آپ کے سامنے ادارہ کے کام کو چلانے کی تین صورتیں اس تصریح کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ ان میں سے کوئی ایک صورت آپ قبول کر لیں اور اسپر قائم رہنے کا وعدہ فرمائیں تب تو میں اس کے چلانے کی ذمہ داری قبول کروں گا اور اگر ان میں سے کوئی صورت آپ کو پسند نہ ہو تو کوئی چوتھی صورت میرے یہاں ٹھہرنے کی نہیں ہے۔

وقف کمیٹی جائیداد اور وقف کے انتظام کی کلیۃً مختار ہو اور نظم و نسق جائیداد کے مصارف وضع کرنے کے بعد خالص آمدنی ادارۂ بیت المال میں داخل کر دیا کرے۔ رہا ادارے کو چلانا اور اسکے مقاصد کو

پورا کرنا اور بیت المال کے روپے کا مصرف متعین کرنا تو اسکے تمام اختیارات بحیثیت رکن وقف کمیٹی مجھے تفویض کر دیئے جائیں۔ میں آپ حضرات سے اور کارکنان ادارہ سے اور بیرونی اہل الرائے اصحاب سے جب جس مسئلہ پر چاہوں گا مشورہ کروں گا اور آپ کو حق ہوگا کہ جس وقت چاہیں مجھے کسی کام میں مشورہ دیں۔ مگر میں کسی مشورے کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا پابند نہ ہوں گا۔ اور نہ کسی کی مداخلت کو گوارا کروں گا۔ البتہ آپ بیت المال میں جس قدر روپیہ داخل کریں اس کا پورا حساب طلب کر سکتے ہیں اور ماہوار، سہ ماہی، یا ہر وقت جب چاہیں حسابات کا معائنہ کر سکتے ہیں تاکہ آپ یہ اطمینان کر سکیں کہ روپیہ جائز مصارف میں صرف ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر کسی مصرف کے متعلق میرے اور کمیٹی کے درمیان اختلاف ہو کہ وہ جائز ہے یا نہیں۔ تو اس کا فیصلہ دو حکم کریں گے جن میں سے ایک میرا مقرر کردہ ہو اور ایک وقف کمیٹی کا۔ بیت المال پر مجھے پورا کنٹرول ہونا چاہیے ورنہ مجھے اختیارات دینا بالکل بے معنی ہے۔ ادارہ کی عمارات کے لیے زمین وقف کا ایک حصہ جو وقف کمیٹی کی منظوری سے میں متعین کروں گا، اسے الگ کر دیا جائے گا۔ اور اس میں ادارہ کی ضروریات کے لحاظ سے جو اور جیسی عمارت میں بنانا چاہوں گا بنا سکوں گا۔

۲

اگر یہ صورت آپ کو پسند نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ عمارات اور ان کے ساتھ زمین وقف کا اس قدر حصہ جس کی مجھے ضرورت ہے، مجھے کرائے پر دے دیا جائے اور یہاں میں اپنی ذمہ داری پر ادارہ قائم کروں۔ کمیٹی وقف کی آمدنی کو اخراجات نظم و نسق وضع کرنے کے بعد ادارے کے حوالے کر دے اور وہ مصارف متعین کر دے جن میں یہ رقم صرف کی جائے۔ کمیٹی صرف اس رقم کی حد تک ادارہ سے حساب لینے کی ذمہ دار ہوگی اسکے علاوہ کسی کام سے اس کو کچھ سروکار نہ ہوگا۔ جس حصۂ زمین کو میں کرایہ پر لوں گا اس پر اگر کمیٹی چاہے تو میری تجویز کے مطابق عمارات بنا دے اور کرایہ میں اضافہ کر دے یا مجھے اجازت دے کہ میں خود اپنی ضرورت کے مطابق عمارت بناؤں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ حضرات سے قطع تعلق کر کے یہاں کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ قانونی طور پر بحیثیت وقف و بحیثیت ارکان مجلس وقف نہ آپ پر کسی کارروائی کی ذمہ داری ہو اور نہ آپ لوگوں کی پوزیشن میرے لیے بند پا بن سکے البتہ اخلاقاً آپ کی جتنی بھی ہمدردیاں مجھے حاصل رہیں اور میرے کاموں میں جتنا بھی آپ ہاتھ بٹائیں اس کا میں خیر مقدم کروں گا۔

۳

اگر اس صورت کو بھی آپ ناپسند کریں تو آخری صورت یہ ہے کہ آپ وقف کی آمدنی بھی اس ادارہ

کو نہ دیں جو میں قائم کرنا چاہتا ہوں اور مجھے صرف کرایہ پر عمارات اور زمین کا ایک حصہ دے دیں وقف کی آمدنی کو آپ اغراضِ وقف کے تحت جہاں چاہیں خرچ کریں۔ ان تین صورتوں پر آپ خوب غور دخوض کر لیں اور جو صورت آپ کو پسند آئے اس کا فیصلہ کر کے مجھے دو روز کے اندر مطلع کر دیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے سوا کوئی چوتھی صورت تلاش کرنے کی کوشش فضول ہے کیونکہ وہ میرے لیے کسی حال میں قابلِ قبول نہ ہوگی۔

اس امر کی تصریح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رسالہ "ترجمان" میں نے ذاتی سرمایہ سے نکالا ہے اور اپنی ذاتی ذمہ داری پر نکال رہا ہوں۔ اسلیے اس کا تعلق کسی مجلس سے نہ ہوگا نہ اس کی پالیسی میں دخل دینے کا کسی کو حق ہوگا نیز اس کے علاوہ اپنی جو کتابیں شائع کروں گا ان کا بھی کسی مجلس سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

ابو الاعلیٰ

(۴ صفر ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء)

بقیہ 'توحید عملی کے انفرادی و اجتماعی تقاضے'

پہنچی ہے ــــ اس مختصر سے مقالے میں اس عظیم سورۃ کے جملہ مضامین کا احاطہ ممکن نہ تھا میں نے محض چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ورنہ اقامتِ دین کا مضمون اس سورۃ میں کتنے مختلف اسالیب میں بیان ہوا، یہ الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ زمر تا سورۃ شوریٰ، ان چار مکی سورتوں میں توحید عملی یا توحید فی الطلب کا مضمون ایک خوبصورت تدریج کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ انفرادی سطح پر توحید عملی کا جو تقاضا ہے "عبادتِ رب اور اخلاص فی الدین" اس کا مفصل ذکر سورۃ زمر میں ہے۔ پھر سورۃ مؤمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ عبادت کے جوہر اور مغز یعنی دعا کو مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل ہے ــــ بقیہ دو سورتوں' یعنی حم السجدہ اور سورۃ شوریٰ میں توحید عملی کے ان تقاضوں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کا تعلق اجتماعی سطح سے ہے۔ یعنی دعوت الی اللہ اور اقامتِ دین۔ دعوت الی اللہ مرکزی مضمون ہے سورۃ حم السجدہ کا اور اقامتِ دین پر مفصل بحث ہے سورۃ شوریٰ میں جہاں توحید عملی کا مضمون اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ آخر میں میں آپ سب حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس طویل مقالے کو پورے اطمینان وسکون سے سنا ــــ وما توفیقی الا باللہ

درسِ حدیث

نزولِ مسیح

ریاض الحق

حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول بالکل حق ہے - اس کی تصدیق ان روایات سے ہوتی ہے جن کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے بیان کیا ہے - خلفاء راشدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ائمہ صالحین اور فقیہانِ اسلام نے اس حقیقت کا اثبات و اعتراف کیا ہے - ان حلقوں اور بزرگ ہستیوں میں سے کسی نے بھی کسی درجے میں کوئی اختلاف نہیں کیا - چنانچہ یہ بات واضح ہو گئی کہ اس پر اجماعِ امت ہے اور مسلمانوں پر اس حقیقت کو ماننا واجب ہے - عیسائی بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دوسری آمد کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کو حق مانتے ہیں ملاحظہ ہو انجیل ۲۲:

Jesus replied, embracing his mother: Believe me, mother, for verily I say to thee That I have not dead at all; for God hath reserved me till near the end of the world.

تاہم کچھ عقلیت پسند لوگ اور خاص طور پر مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دُنیا میں نہیں آئیں گے کیونکہ وہ طبعی موت مرے ہیں - ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو موت کے بعد کشمیر میں سری نگر کے مقام پر دفن کیا گیا ہے - اس بات کا ذکر مولوی محمد علی نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کے ضمن میں کیا ہے (صفحہ نمبر ۶۸۶ حوالہ نمبر ۱۷۲۳)

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے صلیب پر جان دی لیکن وہ دوبارہ جسمانی طور پر زندہ ہوئے اور اس وقت آسمانوں پر زندہ ہیں - برناباس نے اپنی انجیل میں لکھا ہے کہ خدا ہماری اور حضرت مریم کی دل کی بات کو جانتا تھا کہ ہم اپنے آقا حضرت مسیح سے ملنا چاہتے ہیں - وہ فرشتے جو حضرت مریم کے نگران تھے وہ تیسرے

آسمان پر گئے جہاں حضرت مسیح فرشتوں کے جلو میں تھے انہوں نے حضرت کو یہ باتیں بتائیں تو حضرت مسیح نے خدا سے دُعا کی کہ انہیں ان کی ماں اور اُن کے پیروکاروں کو دیکھنے کی طاقت دی جائے - اس پر خدا نے چار مقرب فرشتوں یعنی جبرئیل میکائیل، رافائیل اور یورائیل کو حکم دیا کہ وہ حضرت مسیح کو ان کی ماں کے گھر لے جائیں اور تین دن تک انکی حفاظت کریں اور صرف ان لوگوں کو دیکھنے کی اجازت دیں جو ان کو مانتے ہیں - حضرت مسیح شان و شوکت میں گھرے ہوئے اپنی ماں کے کمرے کی طرف تشریف لائے جہاں وہ اپنی بہنوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اس کے علاوہ لکھنے والا، یوحنا جیمز اور پیٹر بھی موجود تھے - یہ سب لوگ خوف سے گر پڑے لیکن حضرت مسیح نے کہا کہ ڈرو نہیں میں مسیح ہوں اور رونے سے باز رہو کیونکہ میں مرا نہیں گیا بلکہ زندہ ہوں - یہ لوگ بڑی دیر تک حیران رہے کیونکہ وہ جان رہے تھے کہ حضرت مسیح فوت ہو گئے ہیں - تب حضرت مریم نے روتے ہوئے کہا کہ بیٹا مجھے بتاؤ کہ جس خدا نے تمہیں مردے زندہ کرنے کی قوت دی تھی اُس نے تمہیں کیوں موت دے دی - تمہارے دوست تمہارے رشتہ دار اور تمہاری تعلیمات کی بے عزتی ہوئی ہے کیونکہ ہر وہ جو تمہیں چاہتا تھا ایسے ہے جیسے وہ مر گیا ہو - حضرت مسیح نے اپنی ماں کے گلے سے لگ کر کہا ماں، مجھ پر یقین کرو کہ مجھے موت نہیں آئی کیونکہ خدا نے مجھے دنیا کے تقریباً خاتمے کے وقت تک محفوظ کر لیا ہے - حضرت مسیح نے اس بات کی گواہی فرشتوں سے دلوائی"۔

قرآن مجید کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو قتل کیا گیا اور نہ پھانسی دی گئی بلکہ ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا - احادیث کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ ظاہر ہوں گے اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ پر لائیں گے :

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ج وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ط	اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے قتل کر دیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا - انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی چڑھایا بلکہ یہ معاملہ ان کے لئے شبہ میں ڈال دیا گیا -

(سورۃ نساء آیت ۱۵۷)

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰى إِنِّي	جس وقت کہا اللہ نے اے عیسٰی میں
مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ	تجھ کو وصول کروں گا اور اٹھالوں گا
وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ	اپنی طرف اور پاک کروں گا کافروں
كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ	سے اور رکھوں گا تیرے تابعوں
كَفَرُوا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ج	کو اوپر منکروں کے قیامت کے
اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ	دن تک -

(آل عمران آیت ۵۵)

یہ آیات واضح طور پر بتاتی ہیں کہ یہود کا یہ دعوٰی کہ انہوں نے حضرت عیسٰیؑ کو قتل کر دیا یا پھانسی دے دی یہ بالکل غلط ہے - علاوہ ازیں بائبل اور تاریخ سے بھی کچھ ثبوت نہیں ملتا کہ واقعتاً حضرت عیسٰی کو پھانسی دی گئی تھی بلکہ بائبل کے مطابق غدار یہودا اسکاریوتی کو پھانسی دے دی گئی تھی جس کی شکل حضرت عیسٰی جیسی ہوگئی تھی وقت آخر کار قرآن مجید کے بیان کو لازماً ثابت کرے گا -

قادیانی سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۱۷ کو اپنا مستدل بناتے ہیں - یہی آیت ان کا واضح مستدل ہے کہ حضرت عیسٰی طبعی موت مرے کیونکہ آیت میں توفی کا لفظ آیا ہے :

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ	پھر جب تو نے مجھے وصول کر لیا تو
الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ	تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا -

(مائدہ ۱۱۷)

اس توفی کے لفظ سے انہوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ اس سے مراد طبعی موت ہے اور وہ دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے - آیئے دیکھیں کہ کیا ہر جگہ اس لفظ کا معنیٰ طبعی موت ہوتا ہے وہ موت جس سے دوبارہ زندہ کرنا نہیں ہے قرآن حکیم میں آیا ہے -

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ	اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت
مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ	ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں
فِي مَنَامِهَا ۚ (زمر آیت ۴۲)	اپنی نیند میں -

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ	وہی جو تمہیں موت دے دیتا ہے
بِالَّیْلِ۔ (انعام-۶)	رات کو

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ توفّیٰ کا لازمی مفہوم طبعی موت نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب پورا وصول کر لینا، روح کو روک لینا اور نیند کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۢ بَلْ	اور انہوں نے اس کو ہرگز قتل
رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وَكَانَ	نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی
اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝	طرف اٹھا لیا اور اللہ زبردست
(نساء ۱۵۸)	حکمت والا ہے۔

چنانچہ اس آیت سے رفعِ مسیح کے متعلق ناقابل تردید ثبوت مل جاتا ہے کہ ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ اس بات کا ثبوت مندرجہ ذیل آیت سے بھی مل رہا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہوگا
اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ	مگر لازماً اس پر ایمان لائے گا اس
مَوْتِهٖ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ	کی موت سے پہلے اور قیامت کے
عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا ۝	دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔
(نساء ۱۵۹)	

حضرت مسیح کا نزول ہوگا اور تمام اہل کتاب ان کی موت سے پہلے پہلے ان پر ایمان لا کر رہیں گے۔ احادیث یعنی مسلم اور بخاری کی روایات سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ یہودی جو حضرت عیسیٰ کو نہیں مانتے وہ سب حضرت مسیح کے نزول ثانی کے وقت ان پر ایمان لائیں گے۔

جبکہ وہ دوبارہ دُنیا میں تشریف لائیں گے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں کیونکہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو دوبارہ دنیا میں نہیں آتا۔ قرآن حکیم بیان کرتا ہے کہ اللہ نے جس پر موت کا فیصلہ کر لیا ہو اسکی روح کو روک لیا جاتا ہے:۔

اگر حضرت عیسیٰ کو ۲۰۰۰ سال قبل موت آگئی تھی تو وہ دنیا میں کیسے واپس آسکتے ہیں اس کے علاوہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو حضرت عیسیٰ کیسے تشریف لائیں گے اس طرح تو وہ آخری نبی ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نہیں ہوسکتے" یہ قادیانیوں کے نظریات ہیں اگر ان کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر قرآن اور حدیث کی تمام باتوں کو جھٹلانا پڑے گا نعوذ باللہ۔ رہا یہ سوال کہ حضرت عیسیٰ آخری نبی ہوگئے تو اس کی صراحت کردی گئی کہ چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تشریف لائے اس لئے وہ آخری نبی نہیں ہونگے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کوئی شریعت نہیں لائیں گے بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے۔ ان کی آمد ایک نئے رسول کی آمد نہ ہوگی۔

رفع مسیح اور نزول مسیح کے متعلق چند احادیث مشکوٰۃ سے درج ذیل ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ	روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ فرمایا
وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ	ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری
يَّنْزِلَ فِيْكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ	جان ہے عین قریب ہے کہ تم میں
حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرَ	ابن مریم اتریں گے اور تمہارے درمیان
الصَّلِيْبَ وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيْرَ	عدل اور فیصلے کریں گے۔ پھر وہ
وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ وَيَفِيْضَ	صلیب کو توڑ دیں گے سور کو مار دیں
الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ	گے اور جزیہ ختم کردیں گے۔ اور مال
حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ	اتنا زیادہ ہوجائے گا کہ کوئی اس
الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِّنَ	کو قبول نہیں کرے گا یہاں تک کہ ایک
الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا ثُمَّ	سجدہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے،
يَقُوْلُ اَبُوْ هُرَيْرَةَ فَاقْرَءُوْا	اس سے بہتر ہوجائیگا۔ پھر حضرت ابوہریرہ
اِنْ شِئْتُمْ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ	نے کہا تم پڑھو اگر چاہتے ہو اور اہل
الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ	کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا جو ان

قَبْلَ مَوْتِهٖ (الآیۃ) (متفق علیہ)
عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی
اللّٰہ علیہ وسلم لَیَنْزِلَنَّ
اِبْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا عَادِلًا
فَلَیَکْسِرَنَّ الصَّلِیْبَ
وَلَیَقْتُلَنَّ الْخِنْزِیْرَ وَ
وَلَیَضَعَنَّ الْجِزْیَۃَ —
لَیَتْرُکَنَّ الْقِلَاصَ
فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا وَ
وَلَیَذْھَبَنَّ الشَّحْنَاءُ وَ
التَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ وَلَیَدْعُوْنَّ
اِلَی الْمَالِ فَلَا یَقْبَلُہٗ اَحَدٌ
رواہ مسلم وَفِیْ رِوَایَۃٍ
لَھُمَا قَالَ کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا
نَزَلَ اِبْنُ مَرْیَمَ فِیْکُمْ
وَاِمَامُکُمْ مِنْکُمْ ۔

پر انکی موت سے پہلے ایمان نہ لائے"۔
حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے
انہوں نے فرمایا کہ فرمایا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے لازماً نازل
ہوں گے تمہارے درمیان ابن مریم
فیصلے کرتے ہوئے اور عدل کرتے
ہوئے۔ پھر وہ ضرور توڑ دیں گے
صلیب سؤر کو مار دیں گے اور
جزیہ ختم کر دیں گے۔ وہ اونٹنیوں
کو چھوڑ دیں گے اور اس پر زکوٰۃ
وصول کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔
دشمنی، آپس کا بغض اور حسد ختم
ہو جائیں گے۔ وہ مال کی طرف
بلائیں گے بھی تو کوئی مال قبول
نہیں کرے گا یہ مسلم کی روایت ہے
اور ان دونوں کی روایت میں فرمایا۔
تم کیسے ہوگے جب تمہارے درمیان ابن مریم اتریں گے اور تمہارا امام تم ہی
میں سے ہوگا۔

عن جابرٍ قال قال رسول
اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
لَا تَزَالُ طَائِفَۃٌ مِّنْ
اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی
الْحَقِّ ظَاھِرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ
الْقِیَامَۃِ قَالَ فَیَنْزِلُ
عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ فَیَقُوْلُ

حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرمایا
انہوں نے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے میری امت میں سے
ایک جماعت لڑائی جاری رکھے گی
اور وہ غالب ہونگے قیامت کے
دن تک۔ فرمایا پھر نازل ہونگے
عیسیٰ ابن مریم اس جماعت کا امیر

اَمِیرُھُمْ تَعَالَ صَلِّ لَنَا	ان سے کہے گا آگے آیئے ہمیں نماز
فَیَقُوْلُ لَا اِنَّ بَعْضَکُمْ	پڑھائیے۔ وہ فرمائیں گے نہیں تم
عَلٰی بَعْضٍ اُمَرَاءُ تَکْرِمَۃَ	میں سے بعض دوسروں پر امیر
اللّٰہ ھٰذِہِ الاُمَّۃَ۔	ہیں یہ اللہ کی عزت ہے ان لوگوں
(مسلم)	پر (امت محمدؐ مراد ہے)
عن عبد اللہ بن عمرو	عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے
قال قال رسول اللّٰہ صلی	روایت ہے فرمایا انہوں نے
اللہ علیہ وسلم یَنْزِلُ	فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عیسیٰ بن مریم اِلَی	نے حضرت عیسیٰ ابن مریم زمین پر
الارض فیتزوج و	نازل ہوں گے پھر وہ شادی کریں
یُوْلَدُ لَہٗ ویمکث	گے ان کے بچے ہوں گے وہ پینتالیس
خمسًا و اربعین سنۃ	سال رہیں گے۔ پھر وہ وفات
ثم یموت فیدفن معی	پائیں گے اور میرے ساتھ میری
فی قبری فاقوم انا	قبر میں اُن کو دفن کیا جائے گا۔
وعیسٰی بن مریم فی	پھر میںؐ اور عیسیٰ ایک قبر سے ابوبکرؓ
قبرٍ واحدٍ بین ابی	اور حضرت عمرؓ کے درمیان اُٹھیں گے۔
بکرٍ و عُمَرَ (ابن الجوزی)	

مندرجہ بالا احادیث کا مضمون پوری وضاحت اور صفائی سے حضرت عیسیٰ کی دوسری بار آمد کو بیان کرتا ہے تاہم ان احادیث کے تمام مضامین پر بحث کرنے کے لئے یہ مناسب موقع نہیں۔ جب دجال جو کہ بدی کا مجسم کردار ہے، اپنے زہرناک نظریات پھیلائے گا تو تمام لوگ اس کے کمالات اور بدی کے معجزوں سے انتہائی متأثر اور مغلوب ہو جائیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرشتوں کے جلو میں آسمان سے نازل ہوں گے وہ دمشق کے مشرق میں ایک سفید منار پر اتریں گے۔ پھر آپ امام مہدی کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نافذ کرنے آئے ہیں۔ وہ صلیب کو تباہ

کردیں گے جو کہ حضرت مسیح کی صلیب دیئے جانے کی نشانی ہے کیونکہ یہ ایک چھوٹا نشان اور جھوٹا شعار ہے جو غلط فہمی اور بیوقوفی کی وجہ سے عیسائیوں نے اپنا رکھا ہے۔ وہ زمین پر خدا کے دین کو غالب کردیں گے۔ پھر اس دین اور خدا کی بادشاہت میں آپس کی دشمنی حسد نفرت اور بغض ختم ہو جائیں گے۔ ایک بار پھر زمین خدا کی حمد کے نغمے سے لبریز ہو جائے گی۔

حضرت مسیح سُرخ رنگ والے اور بہت خوبصورت ہوں گے۔ ان کے بال گھنگریالے ہوں گے وہ شادی کریں گے اور انکے بچے ہوں گے وہ دجال کی تلاش میں نکلیں گے اور لُدّ کے مقام پر اُسے پالیں گے۔ یہ مقام شام میں بتایا گیا ہے اور اب اسرائیل میں ہے۔ پھر وہ دجال کو اپنے ہاتھوں سے قتل کردیں گے پھر اس وقت تمام یہودی اور عیسائی اسلام قبول کرلیں گے۔ اس طرح قرآن مجید کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہو جائے گی۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ یہ اسلام کا غلبہ ثانی ہوگا۔

اسی طرح قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر بھی مسیح ثابت ہو جائے گی کہ تمام اہل کتاب حضرت مسیح پر ان کی موت سے پہلے ایمان لائیں گے۔ حضرت مسیح کے زمانے میں یاجوج ماجوج حملہ کریں گے لیکن حضرت مسیح ان کے حملے کو ناکام بنادیں گے۔ پھر بہت بھاری مقدار میں بارشیں ہونگی اس سے دنیا میں بہت زیادہ غلہ اور سبزیاں پیدا ہونگی۔ دنیا میں فراوانی ہوگی۔ پھر ایک خوشگوار ہوا چلے گی پھر تمام مسلمان موت کی آغوش میں چلے جائیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ بھی وفات پائیں گے اور ان کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے میں ان کے پہلو میں دفن کیا جائے گا۔ xxxxx

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

(قسط ۲) پروفیسر حافظ احمد یار

قرآنی ادب و ثقافت کا ایک پہلو

اس مضمون کی پہلی قسط حکمتِ قرآن کے مئی ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی دوسری قسط کی اشاعت میں جو تاخیر ہوئی ہے ادارہ اُس پر معذرت خواہ ہے۔

روزمرہ کی گفتگو میں قابلِ استعمال قرآنی فقرے

(بشرط عدم قصد تلاوت محض تمرین عربیت کے لیے !)

کتابوں میں ایک خاتون کا قصہ عموماً مذکور ہے جو اپنے اظہار ما فی الضمیر کے لیے مختلف قرآنی آیات کا ہی استعمال کرتی تھی اور غیر قرآن عبارت بولنے سے ہی اجتناب کرتی تھی۔ یہ اس خاتون کے استحضارِ آیات کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ تاہم بعض دفعہ سامع کو آیت سن کر بھی اصل مطلب تک پہنچنے کے لیے کچھ دماغی ورزش کرنا پڑتی تھی ـــــ قرآن کریم میں متعدد تقریریں، سوال و جواب، مکالمے اور قصے بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو عام روزمرہ کی گفتگو میں حسب موقع استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ اس میں عدم قصد تلاوت اور محض مشق عربیت ملحوظ رہے۔ اس قسم کی چند آیات درج ذیل ہیں۔ ویسے مواقع کے لحاظ سے اس قسم کی آیات کی تعداد غالباً سینکڑوں تک پہنچ سکتی ہے خصوصاً جب کہ ضرب المثل اور جامع تعلیمات پر مشتمل آیات کو بھی بیشتر اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی ہم ترجمہ اور موقع استعمال کی بحث کو بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہوئے صرف حوالۂ آیات دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا (الکہف: ۷۶) (۲) فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (ق: ۳۹)
(۳) لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر: ۹) (۴) مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ؟ (القلم: ۳۶)
(۵) أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ (ھود: ۷۸) (۶) إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ (ھود: ۸۸)
(۷) وَمَآ أُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف: ۵۳) (۸) أَيْنَ الْمَفَرُّ (القیامہ
: ۱۰) (۹) الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر: ۳۴) (۱۰) تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى
(النجم: ۲۲) (۱۱) هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ (ص: ۵۹) (۱۲) إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ
(الشوریٰ: ۴۳) (۱۳) لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ (الصافات: ۶۱) (۱۴) فَلَا تُزَكُّوْٓا
أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم: ۳۲) (۱۵) هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔

(النمل: ۴۴) (۱۶) مَا يَكُوْنُ لِيْٓ أَنْ أَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ (المائدہ ۱۱۶)

نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی کیلئے قرآنی آیات کا استعمال

یہ بہت نازک مقام ہے اور اس کے لیے غیر معمولی استحضار آیات کے علاوہ دینی ذہن اور ایک معیارِ ذوق بھی درکار ہے۔ ذیل میں ایک دو اس قسم کی مثالوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔۔۔۔ عباسی خلیفہ عبداللہ المامون (جسے غلطی سے عام لوگ مامون الرشید لکھ دیتے ہیں) کی شبِ زفاف کا یہ واقعہ اپنی نوعیت کے باعث بہت سے واقعہ نگاروں کے لیے ادبی حاشیہ آرائی کا سبب بنا ہے۔۔۔۔ نوجوان خلیفہ نے جب بے صبری کا مظاہرہ کیا تو دلہن نے برمحل کہا۔۔۔۔ امیرالمؤمنین! أَتٰىٓ أَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (النحل: ۱) (یہاں بھی ترجمہ اور اس کی ادبی لطافت کے بیان کی بجائے صرف حوالۂ آیت کافی ہے۔)

۲۔۔۔۔ کسی اچھی شکل صورت کی ایک عورت کو جاتے دیکھ کر کسی دِل پھینک قسم کے آدمی نے آیت قرآنی۔۔۔۔ وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِيْنَ (الحجر: ۱۶) پڑھ کر گویا ایک طرح سے فقرہ کسا ۔۔۔۔ مگر وہ عورت بھی بلا کی حاضر جواب تھی اس نے فوراً اس سے اگلی آیت۔۔۔۔ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيْمٍ (الحجر: ۱۷) پڑھ کر اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر نوجوان کو شرمندہ کر دیا۔۔۔۔ دونوں کی نکتہ آفرینی کا لطف اٹھانے کے لیے حوالۂ آیت کی مدد سے ترجمہ پر نظر ڈال لیجئے اور عورت کے استحضار کی داد دیجئے۔

۳۔۔۔۔ کبھی کبھی اس مقصد (نکتہ آفرینی) کے لیے آیت نہیں بلکہ کسی آیت کے مضمون پر مبنی مضمون کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی عباسی گورنر نے ایک اپنے صاحبِ شرطہ (پولیس کے بڑے افسر) کو مزاحاً کہا اَيْنَ تَذْهَبُ يَا هَامَانُ؟ (ہامان صاحب کہاں جا رہے ہو؟) تو اس نے جواب میں فوراً کہا، لِأَبْنِيَ لَكَ صَرْحًا (تیرے لیے ایک بلند عمارت بنانے جا رہا ہوں) (اس میں صاحب شرطہ گورنر کو۔۔۔۔ ہامان یا متکبر مشیر کہہ کر طنز کرنے کے جواب میں فرعون کہہ گیا مگر ڈھب سے۔۔۔۔ پوری بات لطیفہ۔۔۔۔ سورۃ القصص: ۳۸ اور سورۃ المؤمن: ۳۶ کے مضمون پر مبنی ہے)

۴۔۔۔۔ کسی طویل القامت مجرم کو کوڑوں کی سزا ملی۔ کوڑے مارنے والا آدمی پست قد کا تھا اس نے مجرم سے کہا، ذرا نیچے ہو! (تاکہ کوڑا ٹھیک پڑ سکے) وہ سزا یافتہ آدمی کہنے لگا

ویلك إلی اکل الفالوذج تدعونی ؟ واللہ لوددتُ أن تکون أنت أقصر من یأجوج ومأجوج وَأنا أطْوَلُ مِنْ عُوْج ۔ (کم بخت تو کون سا مجھے حلوہ کھانے کو بہہ رہا ہے، جو نیچے جھکوں؟ بخدا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو یاجوج ماجوج سے بھی ٹھنگنا ہو جائے اور میں عوج سے بھی زیادہ لمبا ہو جاؤں) خیال رہے اس میں یاجوج ماجوج اور عوج بن عنق کے قد و قامت کے بارے میں غیر مستند مگر عوامی روایات کے مضمون کو اساس جواب بنایا گیا ہے ۔ فافھموا۔

اشعار اور عبارات میں اس قسم کا استعمالِ آیات !

اس کی مثالیں عربی کے علاوہ فارسی، اردو بلکہ پنجابی تک کی شاعری میں بھی متعدد جگہ مل سکتی ہیں مثلاً

۱ــــ وحبیب کلما خاطبتہ قال سلامٌ　　　فاذا ما قلت زرنی قال لی ذا محرم

(اور ایسا دوست کہ جب اسے مخاطب کروں تو کہتا ہے سلام　　　اور جب اسے کہتا ہوں مجھ سے ملاقات کرو تو کہتا ہے یہ حرام ہے)

اس شعر میں سورۃ الفرقان: ۶۳ کے مضمون کی طرف لطیف اشارہ ہے ۔

۲ــــ اما والذی أبکی وَأضحك والذی　　　أمات وأحیا والذی أمرہ الأمر

(ہاں وہ ذات پاک جو رلاتا ہے اور ہنساتا ہے اور جو　　　مارتا ہے اور جلاتا ہے اور جس کا حکم ہی دراصل حکم ہے)

اس شعر کا مضمون سورۃ النجم: ۴۳ : ۴۴ سے ماخوذ ہے بلکہ الفاظ بھی وہیں سے لیے گئے ہیں صرف مصرع اول میں ضرورتِ شعری سے کچھ تقدیم و تاخیر کی ہے ۔ فارسی زبان میں اس کی ایک مشہور مثال ہی پیش کرنا کافی ہے ۔ یہ مثنوی کا شعر ہے ۔

ھرچہ داری خرچ کن در راہ او　　　لن تنالوا البر حتی تنفقوا

اردو میں ظفر علی خان کا صرف ایک شعر لکھا جاتا ہے ۔ ؎

ہے ازبر کُلُوا بھی تجھے واشربُوا بھی　　　کبھی یاد آیا مگر جاھِدُوا بھی ! وغیر ذلک

نثری عبارتوں میں قرآنی آیات کے موزوں اقتباس اور استعمال کی مثالیں مختلف کتابوں کے دیباچوں میں بکثرت مل جاتی ہیں ۔ تاہم اس کی صحیح صورت وہ ہے جہاں وعظ یا اپیل کا مضمون ہو اور وہاں زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لیے قرآنی آیات کو برمحل استعمال کیا جائے ۔ بعض اہل علم کو اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ کچھ خاص اور زیادہ ہی ودیعت کیا ہوتا ہے

ازانجملہ سید جمال الدین افغانی رحمہ اللہ تھے — ان کی تحریروں خصوصاً العروۃ الوثقیٰ کے اداریٰ مقالوں — ایڈیٹوریل — میں اس کی افادیت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ذیل میں العروۃ الوثقیٰ سے ہی ایک دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں — یہاں بھی ہم ترجمہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں اصل حسن عربی عبارت میں قرآنی عبارت کے امتزاج سے پیدا کیا گیا ہے — اور ترجمہ میں وہ حسن وخوبی کسی طرح بھی پیدا نہیں کی جاسکتی اس لیے مبتدی حضرات سے معذرت کے ساتھ صرف اصل عربی عبارت کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ البتہ اہل ذوق شائقین کے لیے العروۃ الوثقیٰ کے مجموعہ مقالات کے متعلقہ صفحوں کا حوالہ پیش کردیتے ہیں۔ یہ حوالے "العروۃ الوثقیٰ" کے مکتبہ اہلیہ بیروت والے ایڈیشن (۱۹۳۳ء) کے مطابق ہیں۔

مسلمانوں کے حکمرانوں کو غیروں سے امید ہائے غم گساری رکھنے پر تنقید کرتے ہوئے ازراہِ خیرخواہی کہتے ہیں "ایها الأمراء العظام مالکم وللأجانب عنکم (هَاأَنْتُمْ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ)۔ قد علمتم شأنهم ولم تبق ريبة في أمرهم (إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا) سارعوا إلى أبناء أوطانكم وإخوان دينكم وملتكم وأقبلوا عليهم ببعض ماتقبلون به على غيرهم تجدوفيهم خير عون وأفضل نصير (آل عمران ۱۱۹، ۱۲۰ کا اقتباس دیکھئے۔)

۲ اہل ایمان کو ابتلاء وآزمائش میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں

إن امتحان الله للمؤمنين سنة من سننه يميز بها الصادقين من المنافقين قرنا بعد قرن إلى أن تنقضي الدنيا في كل قرن يدعو الله المؤمنين إلى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فإن يطيعوا يُؤْتِهِمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وإن يتولوا يُعَذِّبْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (عبارت اور مضمون کے لیے سورۃ الفتح : ۱۷ دیکھئے) فميزان عدل الله منصوب الى يوم القيامة وهنالك الجزاء الأوفى (ماخوذ از النجم: ۴۱) فلا يحسبن الواسمون أنفسهم بسمة الأيمان القانعون منه برسم يلوح في مخيلاتهم، إن عدل الله يتركهم ومايظنون كلا إنهم في كل عام

باقی صـ۹۶ پر)

قرآنی علم وفہم کا درجۂ حکمت (۱۱)

مولانا محمد تقی امینی

قرآنی علم وفہم میں درجۂ حکمت تک رسائی کے لئے انسان کی طرح سماج میں بھی فطری نقطۂ نگاہ سے غور وفکر کی ضرورت ہے جس کا تعین قرآنی آیتوں سے ہوتا ہے۔

سماج ایک ہی خاندان کے افراد کی جمعیت کا نام ہے۔ جن کی طبعی قوتوں اور امکانی صلاحیتوں کے ظہور میں فرق ہوتا ہے۔ یہ جمعیت پہلے دو افراد پر مشتمل تھی پھر ان کی نسل سے رفتہ رفتہ آبادی کی کثرت ہوئی اور ان کی ضرورتوں میں اضافہ ہوا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً[1]

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں"

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ[2]

"اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے تسکین پائے"

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى الخ[3]

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا کہ تم ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرو"

سماج کے افراد میں پہلے یگانگت تھی کوئی اختلاف نہ تھا فطری ہدایت پر قناعت تھی اور کوئی تفرقہ نہ تھا۔ پھر آبادی کی کثرت اور ضروریات زندگی کی وسعت کی وجہ سے رقابت وکشمکش پیدا ہوئی اور باہمی اختلاف ونزاع کی نوبت آئی جس کو رفع کرنے کے لئے فطری ہدایت ناکافی قرار پائی

---

[1] النساء آیت ۱۔ [2] الاعراف آیت ۱۸۹۔ [3] الحجرات آیت ۱۳۔

اور خارجی مدد و رہنمائی کی ضرورت ہوئی۔ بس یہیں سے خارجی مدد و رہنمائی کا وہ سلسلہ شروع کر دیا گیا جس کی نشان دہی اللہ نے بالکل ابتدا میں آدمؑ و اولادِ آدمؑ سے کر دی تھی۔

سماج کی ابتدائی یگانگت کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا[1]

"لوگ (ابتدا میں) ایک ہی امت تھے پھر آپس میں اختلاف کیا"

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً[2]

"لوگ ایک ہی امت تھے (انھوں نے اختلاف کیا) تو اللہ نے انبیاءؑ بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قول فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے تھے ان میں وہ فیصلہ کر دے"

آدمؑ سے ابتدائی نشان دہی یہ ہے۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى[3]

"اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو کفر کریں گے اور میری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"

اولادِ آدم سے ابتدائی نشان دہی یہ ہے۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ[4]

"اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے ہوئے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی اس کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا اور جو میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہی دوزخ والے ہیں"

سماج کی مدد و رہنمائی کا یہ سلسلہ نبیوں اور رسولوں (خاص قسم کے جینئس) کے ذریعہ چلتا رہا جو اعلیٰ ترین و افضل ترین فرد ہوتے تھے کہ اس سے بہتر و محفوظ کوئی اور شکل ممکن نہ تھی۔ یہ حضرات ہر جگہ، ہر قوم اور ہر ملک میں بھیجے گئے۔ کسی دور و زمانہ کا سماج ان سے محروم نہیں رہا۔ قرآن حکیم اس نمونہ کے طور پر شہادت کے لئے چند انھیں نبیوں اور رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی قوم نے

---

[1] یونس آیت ۱۹۔ [2] البقرہ آیت ۲۱۳۔ [3] البقرہ آیت ۳۲-۳۹۔ [4] الاعراف آیت ۳۵-۳۶۔

دنیا کے ابتدائی تمدن کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جن کا سماج اتار چڑھاؤ اور عروج و زوال کی پوری داستان اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ ابتدا حضرت نوح (علیہ السلام) کے تذکرہ سے کی گئی جن کی قوم سرزمین دجلہ و فرات کے دوآبہ (تمدن کا نہایت قدیم گہوارہ) میں آباد تھی۔ پھر عراق و شام، فلسطین اور مصر میں آباد قوموں اور ان میں بھیجے گئے نبیوں اور رسولوں کا تذکرہ ہے جن سے قرآن کے مخاطبین کسی نہ کسی درجہ میں باخبر تھے۔ نمونہ اور شہادت کے لئے اگر ان نبیوں اور رسولوں کو منتخب کیا جاتا جن سے لوگ بالکل ناواقف ہوتے تو پہلے ان کے وجود کا ثبوت ضروری ہوتا پھر اس کے بعد ان کو بطور نمونہ و شہادت پیش کرنے کا حق حاصل ہوتا اور اس طول طویل طریق کار کے الجھاؤ میں وہ مقصد فوت ہو جاتا یا ثانوی درجہ میں آجاتا جس کے لئے قرآن نازل ہوا ہے۔

ان آیتوں میں مختلف عہدوں، قوموں اور زمانوں میں مدد و رہنمائی کا ذکر ہے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ[1]

"اور کتنے ہی نبی ہم نے پہلے لوگوں (ابتدائی عہد) میں بھیجے"

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ[2]

"اے پیغمبر! ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول بھیجے، کچھ ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے بیان کئے اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں بیان کئے"

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ[3]

"ہم نے بہت سے رسولوں پر وحی بھیجی جن کا حال ہم پہلے تم سے بیان کر چکے ہیں اور بہت سے رسولوں کا حال نہیں بیان کیا"

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ[4]

"کوئی امت ایسی نہیں کہ اس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو"

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ — ہر قوم کے لئے ہدایت دینے والا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ[5] — ہر امت کے لئے رسول ہوا ہے۔

طبعی قوتوں اور امکانی صلاحیتوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خود سماج کی مدد و رہنمائی کے لئے کافی ہیں کسی خارجی مدد و رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا

---

[1] الزخرف آیت ۶۔ [2] المومن آیت ۷۸۔ [3] النساء آیت ۱۶۴۔ [4] الفاطر آیت ۲۴۔ [5] الرعد آیت ۷۔ [6] العلق آیت ۵۔

ہے کہ یہ قوتیں اور صلاحیتیں نوری امتزاج کے بعد بار آور ہوتی ہیں۔ انفرادی نوعیت میں اگرچہ سادہ اور سلجھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن امتزاج کے بعد نہایت پیچیدہ اور الجھی ہوتی بن جاتی ہیں جس طرح سونا کان سے نکل کر خام حالت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ قوتیں اور صلاحیتیں خام حالت میں ہوتی ہیں جن کے تزکیہ (صیقل کرنا، نکھار پیدا کرنا) اور تنمیہ (توانائی برقرار رکھنا، بتدریج ترقی دینا) دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ان سے سماج کی تمام تر مدد و رہنمائی کی توقع بے سود ہے۔ نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ جو مدد و رہنمائی آتی ہے وہ ان کو صیقل کرتی ان میں نکھار پیدا کرتی، ان کی توانائی برقرار رکھتی اور ان کو بتدریج ترقی دیتی ہے پھر وہ اپنی شکل میں ظہور کے قابل بنتی ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا[1]	اللہ نے آدمؑ کو سارے نام سکھا دیئے۔
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ[2]	انسان کو وہ سکھایا جو جانتا نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مواقع پر علم سے اجمالی تعلّم ہی مراد ہو سکتا ہے جس سے قوت و صلاحیت کی طرف اشارہ ہے۔

مدد و رہنمائی کا کردار اس آیت میں ہے۔

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ[3]	جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اس کے ذریعہ اللہ ان کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنی توفیق سے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

نبیوں اور رسولوں نے متفقہ طور پر جن امور کی دعوت دی ان سے مدد و رہنمائی کی نوعیت و جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً عقائد و عبادات، نیکی کی قسمیں صالح و مفید کو لینا، فاسد و نقصان دہ کو چھوڑ دینا، لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا، ظلم و زیادتی سے روکنا، نکاح کو پاکیزہ و مقدس سمجھنا، بدکاری کو گندی و قابل کراہت جاننا، صالح اور مضر افکار کے درمیان تفریق کرنا، حلال و حرام اور پاکیزگی و گندگی کے درمیان امتیاز کرنا، گنہگاروں پر اللہ کی سزائیں قائم کرنا، اللہ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنا اور امر الٰہی کی نشر و اشاعت میں اجتہاد سے کام لینا، مدد و رہنمائی کا یہ کردار قوتوں اور صلاحیتوں کے رگ و ریشہ میں سرایت ہوتا اور نسلاً بعد نسلٍ

---

[1] البقرہ آیت ۳۱۔ [2] العلق آیت ۵۔ [3] قاضی ثناء اللہ تفسیر مظہری آیت ۱۶۔ [4] المائدہ آیت ۱۶۔

منتقل ہوتا رہا اور سماجی زندگی میں اس کے اثرات وخواص نمایاں ہوتے رہے۔ اس طرح جس قدر بھی قوتیں اور صلاحیتیں ظہور پذیر ہوئیں یا بعد میں ہوں گی کوئی بھی مدد و رہنمائی کے پرتو سے بے نیاز نہیں ہو سکی اور ان کے ذریعہ جس قدر سماجی زندگی کی ترقی ہوئی یا آئندہ ہوگی ان سب میں اس کی جلوہ آرائیوں سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

در اصل یہ مدد و رہنمائی ان رکاوٹوں کو دور کرتی ہے جو قوتوں اور صلاحیتوں کے اصلی ظہور میں مانع ہوتی ہیں اور وہ غذا فراہم کرتی ہے جو ان کی توانائی برقرار رکھنے اور ان کو بتدریج ترقی دیتے رہنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ جس طرح نامیاتی لہروں کے لئے مادی غذا کی ضرورت ہے، اسی طرح نوری کرنوں کے لئے نوری غذا کی ضرورت ہے۔ لیکن دونوں کی نوعیت، کیفیت اور حاصل کرنے کے طریق میں فرق ہے۔

(۱) لہروں کو زمینی پیداوار سے مناسبت ہے کہ پیکر انسانی زمین ہی کے اجزا سے تیار کیا گیا ہے اور کرنوں کو آسمانی پیداوار سے مناسبت ہے کہ وہ خالص قدرتی عطیہ ہے کسی میکانیکی عمل کا نتیجہ نہیں ہے۔

(۲) زمینی پیداوار سے طبعی مناسبت کی وجہ سے مادی غذا کی شناخت وتلاش میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی ہے، جب کہ آسمانی پیداوار سے فطری مناسبت کے باوجود نورانی غذا کی معرفت وتلاش میں دشواری ہوتی ہے۔

(۳) مادی غذا پر بقائے حیات موقوف ہے اور زندگی باقی رکھنے کے لئے ہر شخص چار و ناچار اس کو حاصل کرنے پر مجبور ہے اور نورانی غذا پر بقائے حیات نہیں بلکہ بقائے انسانیت موقوف ہے کہ اس کو حاصل کئے بغیر بھی انسان زندہ رہتا ہے۔ اگرچہ طبعی قوتوں اور امکانی صلاحیتوں کا ہمہ جہتی ظہور نہیں ہوتا ہے۔

(۴) مادی غذا کی ضرورت کے پیش نظر صرف اس حد تک اس پر حد بندی و پابندی درکار ہے کہ اس کی وجہ سے نوری غذا اور اس کی کارکردگی متاثر نہ ہونے پائے اور نوری غذا کی نزاکت کے پیش نظر تجویز، تشخیص اور تعیین کے ہر ہر مرحلہ میں کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔

مذکورہ مدد و رہنمائی، حلال و حرام، جائز و ناجائز اور پاکیزگی و گندگی میں تفریق کر کے ایک طرف مادی غذا کی حد بندی کرتی اور اس پر پابندی لگاتی ہے اور دوسری طرف ذہنی و فکری اور عملی پروگرام مرتب کر کے نوری غذا کی تجویز، تشخیص اور تعیین کرتی اور اس پر کڑی نگرانی رکھتی

ہے کہ اگر افراط و تفریط پائی گئی تو قوتوں اور صلاحیتوں کی کارکردگی میں تناسب نہ پایا جائے گا۔ پھر زندگی کی طلب و رسد میں توازن برقرار نہ رہے گا اور پھر سماج سے عدل و اعتدال رخصت ہو جائے گا جو مدد و رہنمائی کا مقصود و مطلوب ہے۔

طبعی قوتوں اور امکانی صلاحیتوں کے لئے مادی و نورانی غذا کی فراہمی کے باوجود ان کے ظہور میں فرق ہونا ناگزیر ہے کہ اسی پر نظام عالم کا بقاء و ارتقاء موقوف ہے۔ اگر ظہور میں یکسانیت پیدا ہو جائے تو زندگی کی جدوجہد میں مسابقت نہ باقی رہے گی اور کائناتِ ہست و بود کی نیرنگیاں و گل کاریاں ختم ہو جائیں گی۔

قرآنِ حکیم میں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ [1]

"اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے"

ظہور میں اسی فرق کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل تغیر عن خلقہ فلا تصدقوا بہ [2]	جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو صحیح مان لو لیکن کسی انسان کے بارے میں سنو کہ اس کی خلقت بدل گئی تو صحیح نہ مانو بالآخر وہ اپنی جبلت کی طرف واپس آئے گا۔

حدیث میں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی قوت و صلاحیت نہ جڑ سے اکھاڑ پھینکی جا سکتی ہے اور نہ ظہور کے فرق کو بالکلیہ ختم کر کے یکسانیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ تعلیم و تربیت اور ماحول کی کارگذاری سے انکار نہیں ہے۔ بلاشبہ قوتوں اور صلاحیتوں کے ظہور میں تعلیم و تربیت اور ماحول کو کافی دخل ہے کہ ان کے بغیر بے شمار قوتیں اور صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں یا حسب حیثیت ترقی نہیں کر پاتی ہیں، لیکن بعض ترقی یافتہ ممالک میں فرق مٹا کر یکسانیت پیدا کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اب تک کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ چنانچہ ان کے اداروں میں یکساں تعلیم و تربیت اور ایک ہی ماحول کے باوجود بچوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کے ظہور اور ان کے نتائج میں فرق موجود ہے جس سے ثابت ہے کہ اس فرق کو جڑ سے نہیں اکھاڑ پھینکا جا سکتا ہے۔ تعلیم و تربیت اور ماحول کی کارگذاری قوتوں اور صلاحیتوں کو صیقل کرنے اور حسب حیثیت ان کو ترقی دینے ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] الانعام آیت ۱۶۵ [2] مسند احمد ج ۲ عن حدیث ابی الدرداء و مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر الفصل الثالث۔

کتابیات

سیرۃ الخلیل (باب دوم)

علم الیقین سے عین الیقین تک

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

آسمانوں اور زمین پر مشتمل اس عالم کائنات کی مثال آہنی پٹڑی پر دوڑنے والی اس برقی یا دُخانی انجن کی سی ہے، جس کی حرکت کرنے والی بیرونی کلیں اور تیزی سے گھومنے والے پہیے تو نظر آتے ہیں مگر مال اور سواریوں سے لدے ہوئے لاتعداد بھاری بھرکم ڈبوں کو کھینچنے والی اصل طاقت اور اس کا سرچشمہ دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے مختلف درجوں میں روزانہ سفر کرنے والے اور اس کے ذریعے سے اپنے حسب منشا ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہونے والے ہزاروں اور لاکھوں اچھے خاصے ذہین اور جہاندیدہ لوگ بھی اس کی ساخت و پرداخت، اور اس کے جوف میں سرگرم عمل بے شمار چھوٹے بڑے پرزوں کے باہمی ربط و تعلق اور طریقۂ کارکردگی کو سمجھنے کی نہ تو کوئی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اس قسم کی تحقیقات ان کے لئے چنداں ضروری۔

وہ اس کی کمال باربرداری اور سرعت رفتاری کو دیکھ دیکھ کر حیران تو ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے پس منظر میں حرارت کی دہکتی ہوئی بھٹیوں، توانائی کے پھٹنے والے گولوں اور دوسرے کیمیائی اعمال کے کون و فساد کی کارفرمائیوں سے یکسر ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں۔

ریل میں قانونی رعایتوں کے ساتھ سفر کرنے کے لئے ٹکٹ کا لینا اور کچھ دوسرے معمولی قسم کے انتظامی ضوابط کی پابندی کرنا ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس کے برعکس محکمہ ریلوے کے وہ انجینیرز اور میکینکس کہ جن پر انجن کی خرابی کی صورت میں مرمت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سطحیت پر اکتفا نہیں کر سکتے، فنی مہارت حاصل کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ان کو انجن سازی کے بڑے بڑے کارخانوں اور ورکشاپوں میں داخلے دلائے جاتے ہیں۔ وہاں مشینری کی ساری تفصیلات بتلائی جاتی ہیں۔ پرزوں کے جوڑ و ترتیب کے عملی تجربے کرائے جاتے ہیں اور قوت کے مخزن برق یا اسٹیم کی بابت کافی معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں تاکہ بوقت ضرورت فتور کی صحیح صحیح تشخیص اور اس کے ازالے کی مؤثر

تدابیر کرسکیں۔

بعینہٖ اسی طرح کائنات کی یہ مشینری جو نامعلوم زمانے سے چل رہی ہے ظاہری اجسام اور معنوی اقدار کی دو حقیقتوں سے مل کر بنی ہے، ہماری نظریں اجسام کے طول وعرض اور عمق کی مقداروں پر تو پڑتی ہیں مگر اقدار کے غیر مرئی وجود اور اجسام کے ساتھ ان کی لطیف نسبتوں کی اس ظاہر بینی کے ساتھ قطعاً نہیں پاتیں۔

ظواہر کے اس پورے نظام سے جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے ہم اپنی زندگیوں میں برابر مستفید ہوتے رہتے ہیں اور اس کے ذریعے سے اپنی ضروریات وحوائج کی تکمیل ہوتے، دیکھتے اور سمجھتے رہتے ہیں۔ لیکن بواطن کی اثر آفرینیاں ہماری نگاہوں سے کلی طور پر مستور ومحجوب ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اس جہان رنگ وبو کی صحت وفساد کا زیادہ تر دارومدار انہی معنوی اقدار کے اعتدال اور بے اعتدالی پر ہوتا ہے۔ مگر یہ اسرار ومعارف بھی ہمارے حیطۂ ادراک سے ماوراء ہوتے ہیں۔

عام انسانوں کے لئے صرف اتنی سی بات کافی ہوتی ہے اور اسی کے وہ مکلف بھی ہوتے ہیں کہ ان مخفی قوتوں کی حقانی اور اثر انگیزی کو علمی طور پر تسلیم کریں اور اجسام کے برتنے میں انھیں کے مبنیہ تقاضوں کو مدنظر رکھیں۔

مگر انبیائے کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کی مقدس جماعت جو درحقیقت کارخانۂ قدرت کی فطری رفتار کو قائم رکھنے پر مامور ہوتی ہے اور اس کے ہر سقم اور مرض کی نشان دہی اور اس کی اصلاح وعلاج کے مناسب طریقے تبلانے کی ذمہ دار ہوتی ہے فقط مظاہر اور مناظر کے علم پر قانع نہیں ہوسکتی۔

انسانی افکار واعمال ہی وہ معنوی اور روحانی اقدار ہیں جو بقائے کائنات کی اساس ہیں، افلاک وعناصر کی یہ محیر العقول چکی انہیں کے محور کے گرد گھومتی ہے اگر برق یا اسٹیم کے بغیر ریلوے انجن ایک گام کا فاصلہ طے نہیں کرسکتی تو یقین جانیئے کہ افکار واعمال کی تندرستی اور تنومندی کے بغیر کائنات کی یہ دنیا ایک لمحے کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔

جس قدر معنوی قدروں میں صحت کا عنصر غالب ہوگا اسی قدر عالم میں امن وامان اور خوشحالی ہوگی اور جوں جوں اور جتنا جتنا ان میں فتور پیدا ہوتا ہوگا توں توں اور اتنی اتنی عالم میں کشیدگی اور بدحالی بڑھتی چلی جائے گی تا آنکہ روح کا مکمل فساد مادے کی مکمل تباہی پر منتج ہو اور قیامت کا

ہنگامہ برپا ہو۔

اس تفصیل کی رعایت کے ساتھ اب قرآنی قطعۂ آیت،

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (سورۃ شوریٰ آیت ۵۲) اور اسی طرح ہم نے آپ کے پاس وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے۔

پر غور فرمایئے کہ کس طرح سے علم شریعت پر روح کا اطلاق کیا گیا ہے یہ کوئی تشبیہ نہیں بلکہ عین حقیقت ہے کیونکہ شریعت ..... اس کے اصول و فروع سمیت ..... پر عمل ہی عالم کبریٰ کی صحت و صلاح کا ایسا ہی ضامن ہے جیسے کہ روح انسانی کی صحت و صلاح خود انسان کا، اور جس طرح سے روح انسانی عالم امر سے بھیجی ہوئی ایک مجہول الماہیت حقیقت ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے شریعت عالم امر سے متعلق وہ وحی الٰہی ہے جس کی اصلیت کائنات کے ساتھ اس کے رابطے اور اس پر اثر اندازی کی کیفیت علم ظاہر کی پہنچ سے قطعاً خارج ہے۔

اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ذریعے سے ان کی پوری پوری امتوں کو عقائد و اعمال کی قدرتی نوعیتوں اور ان کی اثر آفرینیوں سے تو آگاہ فرماتا رہا ہے لیکن ان کی عملی کیفیات، تو یہ فقط انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین یا دعوت و تبلیغ کے عظیم کام میں ان کی صحیح جانشینی کرنے والے اولیاء و صلحاء میں سے ہر ایک کو اس کے کام کی عظمت کے اندازے پر حقیقی یا مثالی شکل میں دکھاتا ہے، نیز روح و مادے اور جواہر و اجسام کے باہمی انسلاک کو بھی منکشف فرما دیتے ہیں تاکہ وہ علم الیقین سے گزر کر عین الیقین کے مرتبے پر فائز ہوں اور اس طرح سے وہ ایک طرف تو شرعی احکام کی مصلحتوں کے رازدان بن جائیں اور دوسری طرف طاغوت کے مقابلے میں کسی مرحلے پر بھی وہ جھجک محسوس نہ کریں جو عمل تبلیغ کے کسی بھی کٹھن مرحلے پر استقامت میں مخل ہو۔

سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اپنی برگزیدگی اور جلالتِ قدر کی بدولت معتبر انبیاء میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ قدرت نے کشف الغطاء اور حدید البصری کی نعمتوں سے اس دنیا میں ممکنہ حد تک نوازا تھا اب اس کی ژرف نگاہی مجاز کے ہزاروں رنگین چہروں سے گزر کر پردہ نشین حقائق کا ادراک کر لیتی، اپنے اثنائے حیات میں حقائق شناسی کی تلوار سے باطل کی بے شمار پُرفریب شبیہوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے اور ان کے اندر بھری ہوئی غلاظتوں کو بے نقاب کر دیا قرآنی ارشاد،

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے دکھا

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (سورۃ انعام آیت ۵) — وہی آسمانوں اور زمین کی حکومت تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جاتے،

کی تفسیر میں مشاہدۂ ملکوت کی دوسری روایات کے ساتھ ساتھ ابن عباسؓ کی اس روایت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے جس کو حافظ ابن کثیرؒ نے امام احمدؒ اور ترمذیؒ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے۔

فانه تعالٰی جلی له الامر سترہ وعلانیته فلم یخف علیه شیٔ من اعمال الخلائق فلما جعل یلعن اصحاب الذنوب قال الله انك لا تستطیع هذا فردہ الله کما کان قبل ذلك فیحتمل ان یکون کشف له عن بصرہ حتیٰ رائی ذلك عیانا و یحتمل ان یکون عن بصیرته حتیٰ شاهدہ بفؤادہ و تحققه وعرفه وعلم ما فی ذلك من الحکم الباهرۃ والدلالات القاطعة۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام پر اپنے امر کا ظاہر اور باطن منکشف فرمایا اور لوگوں کے اعمال میں سے کوئی چیز چھپی نہ چھوڑی تو آپ نے گنہگاروں کو لعنت کرنا شروع کیا حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اسے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے چنانچہ دوبارہ پہلی حالت کی طرف لوٹا دیا اب یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آنکھیں کھول دی گئی ہوں اور یہ سب کچھ باصرہ کے مشاہدہ میں آچکا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی فہم و بصیرت روشن اور قوی کردی گئی ہو اور یہ سب کچھ دل کی آنکھ سے دیکھ لیا ہو اور اس کی خوب معرفت حاصل کی ہو اور اس کے اندر جو واضح ترین حکمتیں اور یقین آفرین دلائل تھیں، ان کو بھی سمجھ لیا ہو۔

مگر افسوس کہ علمائے ظاہر بین نے اس پر اس کے مناسبِ حال توجہ نہیں فرمائی۔

عجائباتِ تکوین کا مشاہدہ

اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے تعلق کی صحیح نوعیت کو کون جانے؟ اس کی گہرائیوں، گیرائیوں اور نزاکتوں کا کیسے ٹھیک ٹھیک علم و ادراک ہو، جبکہ عقلِ انسانی کے لئے نہ تو الوہیت کی پوری معرفت ممکن اور نہ ہی نبوت کی تفصیلی شناخت آسان، یہاں تو حرم

واحتیاط کا یہی تقاضا ہے کہ علم و اعتقاد کی اسی مقدار پر قناعت کی جائے جو قرآن و حدیث میں مصرح ہے اسی میں فکر و عمل کی سلامتی اور پختگی کا راز مضمر ہے۔ الٰہیات و نبوات کی فلسفی اور کلامی بحثیں انتشار و بے اطمینانی کے سوا کوئی مفید اضافہ نہیں کر پاتیں[1]۔

بلاشبہ خداوند قدوس کی بارگاہ صمدیت میں کسی کو بھی دم مارنے کی مجال نہیں[2]۔ کون ہے جسے تسلیم و رضا کے علاوہ تابِ سخن ہو یا اطاعت و حکمبرداری کے سوا کسی دوسرے راہ عمل کو اختیار کرنے کی سکت۔ یہاں تو بہت بڑے بڑے گردن فرازوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور "اَسْلِمْ" کے جواب میں طوعاً یا کرہاً "اَسْلَمْتُ" ہی کہنا پڑتا ہے لیکن بایں ہمہ جاہ و جلال کی مرعوبیتوں اور قانون و عدالت کی سختیوں کے بیچ بیچ میں مہر و محبت کی وہ رخصتیں اور فضل و کرم کی وسعتیں بھی جھلکتی ہیں، جہاں دور سے دیکھنے والے کو خالق و مخلوق کی سرحدیں غیر متناہی فاصلوں کے باوجود زمین و آسمان کے افق کی شکل میں باہم ملی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

خلیل اللہ علیہ السلام کی ساری زندگی تفویض و سپردگی کی ایک مسلسل داستان ہے جس

---

[1] الٰہیات کے فلسفی مسائل کی کیا قدر و قیمت ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی "تہافۃ الفلاسفہ" کے مطالعے سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوبات میں کہیں پر ان کا یہ قول نظر سے گزرا ہے کہ ریاضیات میں پوری طرح اور طبیعیات میں کسی حد تک اپنی عقل کا کمال دکھانے والے فلاسفہ جب الٰہیات میں گفتگو کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عقل کی ضروری مقدار بھی ان کے پاس موجود نہیں، اسی طرح سے الٰہیات سے متعلقہ کلامی بحثیں بھی گو فلسفیانہ گمراہیوں کا قلع قمع کرنے میں کسی حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہیں لیکن نہ صرف یہ کہ کسی خالی الذہن انسان کے اطمینان کا ذریعہ نہیں بنتیں بلکہ الٹ ایک ذہنی بے قراری اور تردد کا موجب بنتی ہیں، امام ہمام محمد بن ادریس الشافعیؒ نے ایک موقعہ پر علم کلام کے غلبۂ شر علی الخیر کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی کو یوں مخاطب فرمایا تھا کہ کلام کی بجائے فقہ سے شغل رکھو کیونکہ کسی کا تمہیں کافر کہنے سے یہ بہتر ہے کہ وہ تمہیں فاسق کہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم کلام کے چوٹی کے علماء مثلاً فخر الدین رازیؒ، امام غزالیؒ وغیرہم کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ آخری عمر میں اس سے دست کش اور بیزار ہو گئے ہیں۔

[2] یہ ہمارے شیخ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کا وہ خصوصی جملہ ہے جو کسی کلامی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے بار بار استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے اس میں میرے لئے اظہار مقصود کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی یاد اور شوق و محبت کی چاشنی بھی ہے۔

میں کہیں بھی کوئی ایسا مقام نہیں آتا جہاں ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری جانب ہٹنے پائی ہو، بار بار کی ابتلاؤں میں جب انھوں نے اپنی بندگی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور عبودیت کا کوئی تقاضا ادھورا نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے "سرِّ تکوین" کو ان پر فاش کر دیا اور انھوں نے وہ سب کچھ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا جو عام طور پر علمی دلائل کی روشنی میں دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں اس عظیم المرتبت انسان کو خدا جانے کتنے تجربے کرائے جا چکے ہوں گے لیکن قرآن کریم صرف ایک واقعہ ـــ احیائے موتیٰ ـــ کا بڑی صراحت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اور پھر خود صاحب واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی اس کی علت غائی کی بھی وضاحت کروائی جاتی ہے تاکہ بعد میں آنیوالی نسلیں اس موحد اعظم کی بابت کسی قسم کے اشتباہ والتباس میں نہ پڑیں۔

قرآن مجید کا بیان ہے :-

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۠

(سورہ بقرہ آیت ۲۶۰)

اور یاد کرو جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار! دکھلا مجھے کیونکر زندہ کرے گا تو مردے فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا۔ کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو تو فرمایا تو پکڑ چار جانور اڑنے والے پھر ان کو ہلا لے اپنے ساتھ۔ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا۔ چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

یعنی خلیل اللہ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی کہ مجھے مردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کرا دیجئے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے کیا آپ کو ہماری قدرتِ کاملہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے؟ ابراہیم علیہ السلام کی

درخواست پر حق تعالیٰ کے اس استفسار سے مقصود یہ تھا کہ خلیل اللہ علیہ السّلام کے ایمانِ کامل کا اقرار و اظہار خود ان کی زبان سے کرالیا جائے اور دنیا کو یہ تعلیم بھی مل جائے کہ ایسے سوالات ہمیشہ بے اعتقادی اور فقدانِ ایمان سے پیدا نہیں ہوتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام عرض کرتے ہیں کہ ایمان کے درجے تک تو یقین اب بھی حاصل ہے۔ ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدے کے بعد اطمینان اور زیادہ حاصل ہو جائے کیوں کہ انسان کی فطرت اور افتاد ہی کچھ ایسی ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر ہوتے رہتے ہیں کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوگا یہ ذہنی انتشار سکونِ قلب اور اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرما کر آپؑ کو حکم دیا کہ چار پرندے اپنے پاس جمع کریں پھر ان کو پاس رکھ کر ہلالیں کہ وہ ایسے ہل جائیں اور مانوس ہو جائیں کہ آپ کے بلانے سے فوراً آجایا کریں اور ان کی پوری شناخت بھی ہو جائے تاکہ یہ شبہ نہ رہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو۔ پھر ان جانوروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پروں سمیت ان کا خوب قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں پھر ان کو بلائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کو للکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پر سے پر، خون سے خون اور گوشت سے گوشت مل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی حالت میں زندہ ہو کر دوڑتے دوڑتے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے پاس آئے۔

بعض تفاسیر نے ان چار پرندوں کے نام بھی بتلائے ہیں کہ وہ مور، مرغ، کوّا اور کبوتر تھے لیکن یہ تعیین عقل کی راہ سے تو ہو ہی نہیں سکتی اور اس کی پشت پر کوئی قابلِ قبول نقل و روایت بھی نہیں۔ علاوہ ازیں مقصود واقعہ کہ رب تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا بیان ہے، کی حد تک اس کی ضرورت بھی نہیں۔ لہٰذا یہ اضافہ نہ صرف غیر مستحسن بلکہ نامناسب بھی ہے۔

معجزات ہوں کہ عجائبات تکوین کے مشاہدات، محض حق تعالیٰ کا فعل اور اسی کا عطیہ ہوتے ہیں جن میں ایک مثالی اور مکمل عبودیت کی نشانی و علامت بننے کے سوا انبیاء علیہم السّلام کی کسی ایسی صفت پر دلالت کرنے کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہوتی جو ان

کے کسی مافوق البشری مقام و مرتبے کی جانب مشیر ہو۔ نیز ایک انتہائی ضروری بات اس موقعہ پر سمجھنے کی یہ ہے کہ معجزات تو بلاشبہ نبوّت کا حصہ ہوتے ہیں جو ہر نبی کو نبوّت کے ساتھ ہی بن مانگے عطا کئے جاتے ہیں لیکن تکوینی مشاہدات کا یہ پایہ ہرگز نہیں ان کو زیادہ سے زیادہ ایک اضافی خصوصیت کہا جا سکتا ہے جو کسی کسی کو اور وہ بھی غالباً اس کی درخواست پر میسر ہوتی ہے۔

ارباب تفسیر کی اکثریت ابراہیم علیہ السّلام یا کچھ دوسرے انبیاء علیہم السّلام والتسلیمات کے ایسے ہی عینی مشاہدات کو ایمان کے سلسلے میں علم الیقین سے عین الیقین تک رسائی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایمان و ایقان کی پختگی کا زیادہ تر تعلق ہر نبیؑ کی اپنی شریعت کے اصول و فروع اور عقائد و اعمال کی ان اثر آفرینیوں سے ہوتا ہے جن سے متعلقہ قوم کی تقدیر مرتب ہوتی ہے۔ یہی ایمان کے صعود اور نزول اور بلندی و پستی کا اصل میدان اور جولان گاہ ہے۔ اور اسی کا مشاہدہ ہر نبیؑ کو عالم ظاہر یا عالم روح میں لازمی طور پر اس انداز سے کرایا جاتا ہے جس کے بعد دل میں شک و ریب کی ادنیٰ سی خلش بھی باقی نہیں رہتی۔ یہ چیز حاصل ہو تو بعث بعد الموت پر بھی کسی قابل ذکر استبعاد کا سامعۂ قلب میں کھٹک تک نہیں پڑتی۔ ہاں مشاہدے کی درخواست بھی بے جا نہیں کہ کارخانۂ قدرت سے متعلق اطمینان کا وہ کونسا درجہ ہے جس سے اوپر کا تصوّر نہ کیا جا سکے۔

مزید وضاحت اس بات کی یہ ہے کہ انسان یہ جاننے کا مکلّف ہرگز نہیں کہ جو کچھ ہوا وہ کیوں اور کیسے ہوا؟ وہ مکلّف ہے تو اسی بات کا کہ جو کچھ ہوگا وہ کیوں ہوگا یہاں بھی "کیسے" کی تفصیلات معلوم کرنی اس کی ذمہ داریوں کا حصہ نہیں۔ گویا کہ اس کی اپنی عملی زندگی سے پیشتر ماضی کے بارے میں اس پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ گذشتہ واقعات کا جاننا آنے والے حالات کے سمجھنے میں مفید و مددگار ہو اور اسی ناطے سے اس پر حاوی ہونے کی کوشش کی جائے۔ مگر اس کا اصل کام مستقبل کی تعمیر و تشکیل ہے جس کا میٹریل اور مادہ اسی کی نیت اور عمل سے تیار رہتا ہے۔ مستقبل سے متعلق اس "کیوں" کا جواب ہر دور کی وہ شریعت ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے کسی پیغمبر کے بالواسطہ نازل ہوتی ہے اور جس پر یقین و عمل کرنے سے،

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۝ (سورۃ عنکبوت آیت ۶۹)	اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقت برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھا دیں گے۔

اور

مَنْ عمل بما علم ورثه الله علم ما لم يعلم	جس نے عمل کیا اس پر جو جانا اللہ تعالیٰ اس کو علم دے دے گا انجانے کا بھی۔

کے بموجب اس سلسلے کی "کیسے" کی تفصیلات بھی حسب المراتب سمجھنی اور دیکھنی نصیب ہوتی ہیں[1]

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصدِ وحید یہی ہوتا ہے کہ وہ مستقبل سے متعلق "کیوں" کا جواب یا بالفاظِ دیگر تاثیرِ اعمال کی تفصیلات یا زیادہ آسان اور جامع اصطلاح میں شریعت کا علم فراہم کردیں چنانچہ ان کی ساری زندگیاں اسی فرض کی بجاآوری کیلئے وقف ہوتی ہیں لیکن اس منصبی فرض سے پوری طرح اور مؤثر انداز میں عہدہ برآ ہونے کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ جس مشن پر اس کو مقرر کیا گیا ہے، اس کی صحت و استواری پر وہ ایقان و اطمینان ہو جو کسی کی تردید یا تشکیک سے قطعاً متاثر نہ ہو۔ ورنہ دعوت کے جانگسل اور صبر آزما کام میں نہ تو بیان و برہان کی خوش اسلوبی اور شہ زوری ہوگی اور نہ ہی جہد و سعی میں مداومت و استقامت اور ثانیاً یہ کہ انبیاء صلوات اللہ علیہم والتسلیمات اپنی

---

[1] اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس درجہ شریعت کی پابندی اخلاص و مداومت کے ساتھ ہوگی اسی درجہ میں "کیسے" کی تفصیلات کا انکشاف کم و بیش اور علمی و روحانی اور مادی رنگ میں ہوگا۔ پھر یہ انکشاف جس قدر زیادہ اور قوی ہوگا اس کا اثر پلٹ کر دوبارہ اخلاص و مداومت پر پڑے گا اس طرح سے تاثیر و تاثر کے اس تبادلے میں نامعلوم حد تک پیش رفت ہوگی لیکن انکشاف کی یہ ترتیب و تدریج عام لوگوں کے لئے ہے نبیؑ کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے؟ ظاہر یہ ہے کہ جب نبوت ہی کسبی نہیں بلکہ وہبی اور لدنی ہے تو یہ انکشاف بھی کسی کسب پر موقوف ہرگز نہ ہوگا۔

[2] تاثیرِ اعمال کی تفصیلات یا علم شریعت سے مراد یہ بتلانا ہے کہ نیک اعمال سے ایک حسین (باقی صفحہ آئندہ پر)

سچائی و صداقت پر ایک ایسی واضح دلیل بھی پیش کر سکتے ہوں جو انسانی تجربے کی گرفت میں آنے والا نہ ہو انہیں دوگونہ ضروریات کی تکمیل کے لئے قدرت ہر نبیؑ کو "سرّ ملکوت" بالخصوص اعمالِ انسانی کی تاثیرات کا عملی تجربہ بھی کراتی ہے اور کچھ خوارق ــ معجزات ــ بھی عطا کرتی ہے۔

اس بحث کے بعد اب ان تکوینی مشاہدات کا جائزہ لینا ہے جن کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اجسام و مظاہر کی تخلیق سے اعتیاد و ائتناس کے وہ پردے ہٹا دئے جاتے ہیں جن میں اس کی اعجوبہ کاریاں محجوب ہوتی ہیں۔ چنانچہ تدریج کے جامے میں دیکھی بھالی حقیقتیں اچنبھے بن جاتی ہیں۔

عین الیقین کے سلسلے میں ان مشاہدات کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے قیامت کا ایمان بالغیب ایک مشاہدہ بن جاتا ہے۔ اس سے متعلقہ ہر شک و شبہ زائل ہو جاتا ہے اور دل اضطراب کے بعد اطمینان حاصل کر لیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سب سے بڑا اور اہم غیب شریعت کی صحت و صداقت ہے۔ اس میں عین الیقین کا درجہ حاصل ہو تو دوسرے تمام مغیبات کو اس کی روشنی میں بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے؛ بھلا جو شخص اعمال کی گوناگونی سے انسان کے دنیا و آخرت کی زندگیوں میں بناؤ اور بگاڑ کی تازہ کاریاں دیکھ رہا ہو اس کو بعث بعد الموت پر قدرت میں ادنیٰ سے ادنیٰ تردّد کا کیا سوال و مجال! اعمال کا جو کہ محض اعراض ہیں، دنیا و آخرت کی نعمتوں یا نقمتوں کی شکل اختیار کرنے میں جو استبعاد ہے بعث بعد الموت یا احیائے موتیٰ میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ علاوہ ازیں اعراض کے تشکّل و تجسّم کا اس مادی دنیا میں کوئی واضح نمونہ موجود نہیں جبکہ احیائے موتیٰ کے نظائر و شواہد سے دنیا بھری پڑی ہے جن کی طرف معمولی سا التفات بھی ہر شک و شبہ کو زائل کرنے کیلئے کافی ہے۔

قرآن حکیم نے جابجا ان نظائر پر بڑے پیارے اور دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے "گلے از گلزارے" کے طور پر چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

(تسلسل) اور پسندیدہ مستقبل کا نقشہ تیار ہوگا اور برے اعمال سے بھدے اور بھیانک مستقبل کا اور پھر برے اعمال کے اصول اور ضروری جزئیات کی وضاحت۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ط اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ط اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(سورۃ حم السجدۃ آیت ۳۹)

اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے دبی دبائی پڑی ہے لیکن جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے تو وہی جس نے اس زمین کو جی اٹھایا وہی مُردوں کو بھی کھڑا کرے گا۔ بے شک وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝

(سورۃ قیامۃ آیات ۳۷ تا ۴۰)

کیا یہ شخص (محض) ایک قطرۂ منی نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ نے اسے انسان بنایا پھر اعضاء ٹھیک کئے پھر اس کی دو قسمیں کر دیں، مرد اور عورت تو کیا ایسی (ذات) اس پر قدرت نہیں رکھتی کہ مُردوں کو زندہ کرے۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ط بَلٰى ق وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝

کہنے لگا کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں۔ آپ کہہ دیجئے انہیں وہی زندہ کریگا جس نے انہیں اول بار پیدا کیا تھا۔ اور وہی سب طرح کا پیدا کرنا خوب جانتا ہے اور وہ ایسا ہے کہ ہرے درخت سے آگ تمہارے لئے پیدا کرتا ہے پھر تم اس سے (اور) آگ سلگا لیتے ہو تو کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر ڈالا ہے اس پر

(سورۃ یٰسین آیات ۷۸ تا ۸۱) قادر نہیں کہ ان جیسے لوگوں کو (دوبارہ) پیدا کر دے؟ ضرور (قادر ہے) اور وہ بڑا پیدا کرنے والا ہے۔ خوب جاننے والا ہے

ان حقائق کے پیشِ نظر ہم یہ کہنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے کہ ایمان کے سلسلے میں عین الیقین تو ہر نبی کو "سیرِ ملکوت"، خاص کر اعمالِ انسانی کی تاثیرات کے اپنے مناسب حال مشاہدے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ،

وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ؁ اور تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

(سورۃ انعام آیت ۷۵)

کو ابراہیم علیہ السلام کے سیرِ ملکوت کے ساتھ جس طرح سے جوڑا گیا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبوّت کے لیے ضروری یقین کا سیرِ ملکوت سے خاص تعلق ہے اسی "سیرِ ملکوت" سے احیائے موتیٰ، سرِّ تکوین پر بھی اس قدر روشنی پڑ جاتی ہے جس میں تردّد نام کی کوئی چیز ٹکنے کی نہیں۔ ہاں مادّی آنکھوں سے نظارہ کی بات ہی اور ہے مگر اس سے پہلے اور بعد والے اطمینان میں کوئی نوعی فرق ہرگز نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ ایک صنفی فرق مانا جا سکتا ہے۔

قارئین متوجہ ہوں!

ماہنامہ "حکمت قرآن" کے بعض مستقل خریداروں کی شکایت کے پیشِ نظر ادارے نے طے کیا ہے کہ آئندہ سے چندہ ختم ہو جانے کی اطلاع پیشگی طور پر دو ماہ قبل دے دی جایا کرے گی۔ تاکہ جو حضرات منی آرڈر بھیجنا چاہیں وہ بروقت منی آرڈر ہمیں ارسال کر دیں۔ اور اس طرح یہ تکلیف دہ صورت نہ پیش آتے کہ آپ کی جانب سے منی آرڈر بھیجا جا چکا ہو لیکن بروقت ہم تک نہ پہنچنے کی وجہ سے ہم یہاں سے رسالہ وی پی بھیج دیں (ادارہ)

معاشرتی بہبود کا تعارف اور — اس کے قرآنی تقاضے

طاہرہ شاکر، ریسرچ سکالر
ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

دور جدید کی سائنسی ترقی نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔ جن کی وجہ سے نئے نئے معاشرتی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جن عمرانی علوم نے ان مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں سائنٹفک طریقے استعمال کئے ہیں، ان میں معاشرتی بہبود سرفہرست ہے۔ معاشرتی بہبود ان چند تصورات میں سے ہے جن کا مفہوم بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ان کے خیال میں غریبوں کی امداد کرنا ہی معاشرتی بہبود ہے اور ہر اصلاحی کارکن اور صاحب خیر کو معاشرتی کارکن کہلانے کا حقدار سمجھتے ہیں۔ یہ تصورات غلط فہمی اور کم علمی پر مبنی ہیں۔ معاشرتی بہبود خیرات نہیں بلکہ امداد کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اس میں تمام خدمات بامقصد اور منظم طریقے سے مہیا کی جاتی ہیں۔ تاکہ افراد اپنی ضروریات اچھی طرح پوری کر سکیں۔ اس سلسلے میں مولانا امین احسن اصلاحی 'اسلامی ریاست' میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"معاشرتی بہبود ایک طریقہ کار ہے۔ یا خدمت بہم پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ جو فرد کی شخصیت اور اس کے ذاتی وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکی انفرادی اور اجتماعی سطح پر مدد کرتا ہے۔ تاکہ وہ شخص کارآمد شہری بن کر اپنے خاندان و جماعت اور ملک و قوم کے لئے اپنی صلاحیتوں کو

استعمال کر سکے۔

مشہور مصری سکالر یوسف القرضاوی معاشرتی بہبود کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"معاشرتی بہبود ایک پیشہ ہے جو باہمی میل جول کی مدد سے پسماندہ افراد، خاندانوں اور گروہوں کی غیر آسودہ ضروریات کو جماعت کے وسائل استعمال کر کے پورا کرتا ہے۔ معاشرتی کارکن فرد کی زندگی میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے، جن سے فرد اور اس کے ماحول میں ہم آہنگی ہو۔ کارکن کا کام ماحول کو بہتر بنانا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہیں جن میں فرد اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے خود اپنے معاشرے کے لئے کارآمد ثابت ہو۔ معاشرتی بہبود ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دیتا ہے۔ جو افراد کے ذاتی اور معاشرتی تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے، اس کا مقصد لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانا اور معاشرے سے ناانصافی غربت اور فرقہ واریت کو دور کرنا ہے۔ جو کہ موجودہ معاشرے کی سب سے بڑی لعنتیں ہیں"[1]

معاشرتی بہبود کے مختصر سے تعارف کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام جو ایک عالمگیر دین ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حسین توازن قائم کرتا ہے وہ اپنے ماننے والوں سے اس کا تقاضا کس انداز سے کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝[2]

"اور کیا آپ نہیں جانتے کہ مشکل ترین کام کیا ہے۔ کسی گردن کا

۱۔ یوسف القرضاوی، اسلام اور معاشی تحفظ، (لاہور ۱۹۸۰ء)

۲۔ القرآن الحکیم، ۹۰ (سورۃ البلد): ۱۰-۱۲

چھڑانا - فاقہ کے دن میں کسی یتیم کو یا کسی خاک نشین کو کھانا کھلانا،
قرآن حکیم نے ایسے نمازیوں کو ہلاکت کی وعید سنائی ہے - جو نماز کو رکوع
و سجود تک محدود رکھتے ہیں اور انسانیت کو اس کے دکھوں سے نجات نہیں دلاتے -

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝
الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝

"ایسے نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں - جو
ریاکاری کرتے ہیں اور اشیاءِ ضرورت کو روکتے ہیں" [1]

ان آیاتِ مبارکہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی بہبود کا بنیادی
مقصد معاشرے کے محتاجوں، بے کسوں، معذوروں، بیماروں اور بے سہارا
لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کی فلاح و بہبود ہے - یہ مقصد اسی صورت میں حاصل
ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی ضرورت و احتیاج دور کرنے کے لئے مالدار لوگ
دولت خرچ کریں - اللہ تعالیٰ ان کے خرچ کو اپنے ذمے قرض حسنہ قرار دیتے
ہیں اور اسکی ادائیگی کے وقت اسے دوگنا کر دیا جائے گا -

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا
حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ۝

"جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں - مرد بھی عورتیں بھی اور اللہ
کو قرض حسن دیتے ہیں - ان کو دوگنا دیا جائے گا اور ان کے لئے اجر
کریم ہے -" [2]

مخلص اور نیک دل انسان اپنا مال و دولت بے غرض اور بے لوث خرچ
کرتے ہیں - اور اس قرض کے عوض محتاجوں اور بے کسوں سے کسی بدلہ اور
جزاء کے خواستگار نہیں ہوتے -

---

[1] - القرآن الحکیم، ۱۰۷: ۴ - ۷ (سورۃ الماعون)
[2] - القرآن الحکیم، ۵۷: ۱۸ (سورۃ الحدید)

بلکہ وہ کہتے ہیں۔

اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔

جو تمہیں کھلاتے ہیں تو خالص اللہ کے لئے ایسا کرتے ہیں ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری ۔ [۴۱]

اقبال نے اسی بات کو ایک شعر کی صورت میں سمویا ہے :

جس کا عمل ہے بے غرض اسکی جزا کچھ اور ہے طائرک بلند بال دانہ ودام سے گزر

مگر جو مالدار اور دولت مند اپنے مال و دولت کو معاشرتی بہبود پر خرچ نہیں کرتے اور اپنا مال عیش وعشرت پر لٹاتے ہیں ، وہ اللہ تعالےٰ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں اور دولت کے کنز وجمع کے عوض جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ خریدتے ہیں ۔

وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ہ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ہ

" اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ۔ انہیں اس دن کے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دیں جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا ، پھر اس سے انکی پیشانیاں اور انکے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا ۔کہ یہ وہی ہے ۔جو تم نے اپنے لئے جمع کیا ہے ۔ سو تم اب اس جمع کرنے کا مزہ چکھو" [۴۲]

---

[۴۱] ۔ القرآن الحکیم ، ۷۶ (سورۃ الدھر) ۹

[۴۲] ۔ القرآن الحکیم ، ۹ (سورۃ التوبہ) : ۳۴ ۔ ۳۵

اُسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انسانیت کی فلاح و بہبود بالخصوص مصیبت زدہ مفلوک الحال اور مفلس و محتاج لوگوں کو باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانا آپ کی بعثت کے اعلیٰ ترین مقاصد تھے۔

بخاری و مسلم کی متفقہ روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"بیواؤں اور مسکینوں کی مصیبتوں کو دور کرنے میں کوشاں شخص اجر و ثواب میں اس شخص کے برابر ہے جو ہمیشہ نماز میں مصروف رہتا ہے اور اس میں کوئی وقفہ نہیں کرتا۔ ہمیشہ روزہ رکھتا ہے اور کبھی افطار نہیں کرتا"

ابوداؤد اور ترمذی کی روایت کے مطابق:

"جو لوگ دوسروں پر رحم نہیں کرتے۔ رحمٰن ان پر رحم نہیں کرتا۔ اہل زمین پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا"

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق:

"میں اور یتیم و بے کس کی کفالت کرنے والا جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہوں گے جس طرح انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی ایک دوسرے کے ساتھ ہیں"

آنحضرتؐ نے قبل از نبوت مکہ کے ظالمانہ ماحول میں بھی سخت نامساعد حالات کے باوجود چالیس برس کی عمر تک مسلسل غربا و فقرا کی خدمت کی۔ اس سلسلے میں جو آپ کا لائحہ عمل تھا اسے اگر آج ہم مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنا لیں تو نہ صرف اسلامی دُنیا جنت نظیر بن سکتی ہے۔ بلکہ پوری دنیا آنحضرتؐ کو صحیح معنوں میں رحمت دوعالم ماننے پر مجبور ہو سکتی ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت ۱۷۷، اسلامی عقائد، عبادات اور معاشرتی فلاح و بہبود کا عالمگیر چارٹر ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَ

الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ

ترجمہ :- "نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر یوم آخرت پر فرشتوں پر کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور ان کی محبت میں اپنا مال عزیزوں، یتیموں مسکینوں سائلوں مسافروں کو دیں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں"۔ [1]

انسانی فوز و فلاح کے اس چارٹر کے مطابق اصل نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے ایمانیات کے نتیجے میں اپنے مال و دولت کے ساتھ محبت و رغبت کے باوجود اسے معاشرتی بہبود کے کاموں پر خرچ کرے۔

اسلام کے نظام معاشرتی بہبود اور اسلام کی رُوحانی اور اخلاقی اقدار میں گہرا تعلق ہے۔ اسلام کی یہ اقدار انسان کو ایثار و قربانی اور بے لوث خدمتِ خلق پر آمادہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں انصار مدینہ کا ایثار تاریخ عالم میں ضرب المثل اختیار کر گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی بے لوث خدمات کو دوام بخشنے کے لئے ان کا ذکر اپنی ابدی کتاب قرآن حکیم میں اس طرح کیا ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ

وہ لوگوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوتے ہیں۔ [2]

(یعنی انصارِ مدینہ مہاجرینِ مکہ کو اپنی جانوں پر مقدم رکھتے ہیں)۔

سیّد ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم لکھتے ہیں۔

"اسلام آخری اور مکمل دین ہے۔ اس لئے اس نے ہر قسم کے انسانوں کی فطرت کے مطابق ہدایت فرمادی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لئے روحانی اور اخلاقی اقدار کے ساتھ قانونی اور انتظامی ضابطوں

---

[1] - القرآن الحکیم، ۲ (سورۃ البقرہ)، : ۱۷۷

[2] - القرآن الحکیم، ۵۹ (سورۃ الحشر)، : ۹

کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس ضرورت کے پیش نظر اسلام میں اخلاقی وقانونی ضابطوں کے درمیان حسین امتزاج پیدا ہوگیا ہے۔"

معاشرتی بہبود کے بنیادی اصول سورہ بقرہ آیت ۱۷۷ میں بیان کرتے ہوئے انہی اصولوں کو عہد رسالت کے آخر میں قانونی حیثیت دے کر حکومت اسلامیہ کی باضابطہ حکمت عملی قرار دیا گیا ۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

صدقات (زکوٰۃ) تو فقراء، مساکین اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کو آزاد کرانے میں اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی مدد میں (یہ مال خرچ کرنا چاہیئے) یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے ۔ اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے ۔"

اس آیت میں ہر قسم کے بے کس، مجبور محتاج اور بے سہارا لوگوں کا ذکر ہے ۔ حکومت اسلامیہ مفلس ومحتاج لوگوں کی اس طرح مدد کرتی تھی کہ وہ فقر و فاقہ اور افلاس پر خود قابو پانے کے قابل ہو جاتے تھے ۔ مگر دور حاضر کا یہ عجیب تضاد ہے کہ ایک طرف سائنسی اور تکنیکی علوم میں حیرت انگیز ترقی کے سبب صنعت، زراعت اور تجارت کو بے حد فروغ حاصل ہو رہا ہے اور دوسری طرف بیکاری بے روزگاری، فقر وفاقہ، بے چینی، بدامنی اور اضطراب میں بھی اس نسبت سے اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس صورت حال نے بے شمار معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی مسائل کو جنم دیا ہے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد شہر بڑی بڑی صنعتوں کے مرکز بنتے چلے گئے ۔ اور دیہاتی آبادی ذرائع روزگار کی تلاش میں دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی ۔ آبادی کی یہ نقل مکانی اس وسیع پیمانے پر ہوئی کہ شہر ہر قسم

کے مسائل کی آماجگاہ بن گئے۔ رہائش خوراک لباس ٹرانسپورٹ تعلیم علاج کے لاتعداد مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان مسائل کا حل یہ سوچا گیا ہے کہ نواحی بستیاں آباد کی جائیں۔ بسوں اور ٹرینوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ غلے کے گودام وسیع کئے جائیں۔ درسگاہوں اور ہسپتالوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ مگر شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر جو ترقیاتی منصوبے تیار کیے گئے ہیں ان کی تکمیل تک نئی نقل مکانی نے شہروں کی آبادی میں کئی گنا اور اضافہ کر دیا۔ پاکستان بھی آج کل ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے۔ شہروں میں کھیل کود کے میدان سیرگاہیں، باغات کارپوریشنوں اور میونسپل کمیٹیوں کے قطعات کو یہ نقل مکانی ہڑپ کر چکی ہے اور اب معلوم ہوتا ہے کہ نئی آبادیاں بھی آبادیوں کی نذر ہو جائیں گے۔ اس پس منظر میں معاشرتی بہبود کے کاموں کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس شعبہ میں بھی خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے کے برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری و نیم سرکاری رفاہی اداروں کی ساری توجہ شہری مسائل کے حل پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ جتنا حل ہوتا ہے اس سے زیادہ الجھتا ہے۔ اس صورت حال سے بہتر طور پر نپٹنے کے لئے عہد خلافت راشدہ اور عہد رسالت کے معاشرتی و معاشی اداروں کو اپنایا جائے۔ اسوۂ رسول پر عمل کرتے ہوئے آبادی کے خوشحال لوگ اس آبادی کے پامال لوگوں کے لئے مال جمع کریں۔ سرکاری و نیم سرکاری رفاہی و معاشرتی بہبود کے ادارے اس مال کے ذریعے غریب اور مفلسوں کو گھریلو دستکاریوں اور چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کرنے میں مدد دیں۔ اسی طرح صرف شہروں کو صنعتی مراکز بنانے پر زور دینے کی بجائے مختلف مصنوعات کی صنعتیں ایسے علاقوں میں قائم کی جائیں جن میں ان صنعتوں کے لئے خام مال پیدا ہوتا ہے۔ تاکہ کارخانوں میں کام کرنے والے کارکن دور دراز کی نقل مکانی سے بچ سکیں۔ اس وقت جو اربوں روپیہ خود ساختہ شہری مسائل کے حل پہ خرچ کیا جا رہا ہے اسے دیہاتی علاقوں میں ذرائع مواصلات اور نقل و حمل کے ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کیا جائے۔ معیشت کے اس نظام کے قیام سے

معاشرتی بہبود کے کاموں میں کافی سہولت ہو جائے گی۔

ہمارے معاشرتی و معاشی مسائل کا واحد حل اسلام ہے اور اسلام بھی کامل و مکمل۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۔ "مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک اسلام کو دینی اور دنیوی امور میں یکساں طور پر نہ اپنایا جائے۔ اس وقت تک اس کے صحیح ثمرات سے فائدہ نہیں ہو سکتا۔

الغرض اسلام نے اپنے ماننے والوں کو فلاح عامہ کا ایک واضح تصور اور جامع پروگرام دیا ہے۔ یہی وہ اعلیٰ اصول و تعلیمات ہیں جن کو عملی شکل دینا پورے معاشرے کا فرض ہے۔ اس پروگرام میں شریک ہونا ایک عام شہری سے لے کر مملکت کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز سب کا مشترکہ اور انفرادی فرض ہے۔ انہی تعلیمات پر عمل کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ معرض وجود میں آسکتا ہے جس کو بقول علامہ اقبال "اخلاقی جمہوریت" اور مغربی مفکرین کی اصطلاح میں "فلاحی مملکت" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

آج کی دنیا انسان سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے لاتعداد اقسام کے پروگرام وضع کئے ہیں۔ بین الاقوامی مجلس یو۔این۔او کا نعرہ ہے کہ سارے عالم سے جہالت، بھوک اور بیماری کا خاتمہ کر دیا جائے۔ سماجی و معاشرتی بہبود کے بڑے بڑے اداروں کا قیام، ہر ملک کے اندر ان اداروں کی لاتعداد شاخیں، سوشل ورکرز کی تربیت کا اہتمام اور ان اداروں پر خرچ اس لئے کیا جاتا ہے کہ انسانیت کی مدد ہو۔ سوشل ویلفیئر پلاننگ کے نام پر بڑے بڑے جاذب نظر پروگرام اور اصطلاحیں بننے میں آتی ہیں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان لاتعداد اداروں کی انسانی فلاح و بہبود کیلئے یہ کوششیں حقیقی معنوں میں بار آور نہیں ہو سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید

(باقی صـ ۹۶ پر)

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام

مزارعت اور عقلی وقیاسی دلائل

(پندرھویں اور آخری قسط)

از قلم: مولانا محمد طاسین

اس دلیل کا جواب ان حضرات کی طرف سے جو مزارعت کو ناجائز کہتے ہیں یہ دیا گیا ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیوی معاملات سے متعلق اسلامی احکام میں بندوں کی حاجت وضرورت اور مصلحت ومنفعت کو پوری طرح ملحوظ ومدنظر رکھا گیا ہے لیکن صرف اس ضرورت وحاجت اور اس مصلحت ومنفعت کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو بعض خاص انسانوں سے نہیں بلکہ عام انسانوں سے تعلق رکھتی اور دائمی ومستقل نوعیت کی ہے اور دلیل مذکور میں جس ضرورت ومصلحت کا ذکر ہے وہ ایسے افراد سے تعلق رکھتی ہے جن کی تعداد معاشرے میں ایک فی صد بھی نہیں ہوتی، جہاں تک عام انسانوں اور اجتماعی ضرورت ومصلحت کا تعلق ہے وہ مزارعت کے جواز سے نہیں بلکہ عدم جواز سے پوری ہوتی ہے۔ اسلام کی نظر میں معاشرۂ انسانی اور عامۃ الناس کی سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت اور مصلحت، عدل وانصاف ہے جس کے قیام پر عام امن وسلامتی اور تعمیر وترقی کا دار ومدار ہے۔ عدل کے بغیر کوئی معاشرہ نہ صلاح وفلاح سے ہم کنار ہو سکتا ہے اور نہ تعمیر وترقی کے مراحل طے کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے جملہ احکامات میں عدل کو پوری طرح ملحوظ ومدنظر رکھا اور اس پر زور دیا ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا ملے اور کسی کی ذرہ برابر حق تلفی واقع نہ ہو، چنانچہ اس نے اسی عدل کے پیش نظر ایسے معاشی معاملات کو حلال اور جائز قرار دیا ہے جن سے ہر فریق کے حق کا ٹھیک ٹھیک تحفظ ہوتا تھا اور ایسے معاشی معاملات کو ناجائز وممنوع ٹھہرایا ہے جن میں کسی فریق کی ضرور حق تلفی ہوتی اور اسے نقصان پہنچتا تھا، چونکہ معاملہ مزارعت میں بھی ایک فریق یعنی کاشت کار کی لازماً حق تلفی ہوتی تھی لہٰذا وہ ناجائز قرار پائی۔ دراصل یہی فلسفہ ربوٰ کے حرام وناجائز ہونے کا بھی ہے۔ پھر جس طرح کسی بیوہ، یتیم، معذور، بوڑھے اور بیمار کی ضرورت ومصلحت کی خاطر ربوٰ حلال وجائز نہیں ہو سکتی اسی طرح مذکورہ

افراد کے لئے مزارعت بھی حلال وجائز نہیں ہوسکتی۔ مطلب یہ کہ جو چیز پچانوے فی صد افراد کے لئے مضر ہونے کی وجہ سے حرام وناجائز ہو وہ پانچ فیصد افراد کے لئے مفید ہونے کی وجہ سے حلال وجائز نہیں ہوسکتی ورنہ حلال وحرام کا سارا نظام درہم برہم ہوکر رہ جائے گا

دراصل قانون کا تعلق معاشرے کی عظیم اکثریت کے عمومی حالات سے ہوتا ہے معمولی اقلیت اور معدودے چند افراد کے خصوصی حالات سے نہیں ہوا کرتا۔ قانون وضع کرتے وقت چند مخصوص لوگوں کے محدود مفاد کو نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ عام لوگوں کے وسیع تر اجتماعی مفاد کو دیکھا جاتا ہے۔ جو چیز عامۃ الناس کے لئے مفید ونفع بخش ہو وہ قانوناً جائز قرار پاتی ہے۔ اگرچہ بعض افراد کے لئے مفید نہ ہو، اسی طرح جو چیز معاشرے کی بڑی اکثریت کے لئے مضر اور نقصان دہ ہو وہ قانوناً ناجائز ٹھہرتی ہے۔ اگرچہ بعض افراد کے لئے مفید ونفع بخش ہو۔ غرضیکہ کوئی قانون نہ سو فیصد افراد کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ سو فیصد افراد کے لئے مضر، بلکہ کچھ افراد ضرور ایسے نکلتے ہیں جن کے لئے قانون مفید یا مضر نہیں ہوا کرتا۔ گویا کوئی قانون حقیقی معنوں میں کلی نہیں ہوتا بلکہ اکثریتی معنوں میں عمومی ہوتا ہے

رہا یہ سوال کہ اگر مزارعت ممنوع اور ناجائز ہو تو پھر مذکورہ قسم کے معذور افراد کی زمینوں کی کاشت کاری کا کیا انتظام اور ان کی معاشی پریشانی کا کیا علاج ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ کہ احادیث نبویہ میں نہایت واضح ہدایت ہے کہ جو شخص کسی عذر کی وجہ سے اپنی زمین کو خود کاشت نہ کرسکتا ہو وہ اپنے دوسرے بھائی کو بلا معاوضہ مفت کاشت کے لئے دے دے۔ جو کاشت کرسکتا ہو ورنہ یونہی بلا کاشت کے چھوڑ دے۔

اور پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زمینیں فروخت کرکے ان سے حاصل شدہ رقم کو ایسے لوگ استعمال کریں، اگر ان میں کچھ لوگ بچے اور نابالغ ہوں تو ان کے سرپرست وارث خرید وفروخت کا یہ کام کرسکتے ہیں۔ بعض حالات میں یہ ذمہ داری حکومت پر عائد ہوجاتی ہے، گویا ایسے معذور افراد کو ایک مال کے بدلے جس سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے دوسرا مال مل سکتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اب اگر کچھ عرصہ کے بعد یہ دوسرا مال ان کے پاس ختم ہوجاتا اور وہ معاشی بدحالی وپریشانی کا شکار ہوجاتے ہیں اور ان کے رشتہ داروں میں سے کوئی ان کی کفالت نہیں کرتا تو ان کی کفالت کی ذمہ داری پورے معاشرے اور معاشرے کی نمائندہ حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ وہ قومی بیت المال سے ان کی کفالت

کر سکتی ہے اور انہیں معاشی سہارا دے سکتی ہے، مطلب یہ کہ صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت موجود ہو تو کسی فرد کی معاشی پریشانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کبھی اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ ان کی حاجت اور مصلحت کی خاطر کسی حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز قرار دیا جائے۔

اور پھر دلیل مذکور میں ایک بڑی کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ چند معذور لوگوں کی وجہ سے جو اپنی زمینوں کو خود کاشت نہیں کر سکتے بکثرت ایسے غیر معذور لوگوں کے لئے مزارعت کو جائز قرار دیتی ہے جو خود اپنی اراضی کو کاشت کر سکتے لیکن آرام و سہولت کی خاطر خود کاشت نہیں کرتے اور دوسروں کو مزارعت پر دیتے ہیں یا اپنا تمول بڑھانے کی خاطر اپنی فاضل اراضی دوسروں سے مزارعت پر کاشت کراتے ہیں جن کے پاس سینکڑوں اور ہزاروں ایکڑ اراضی ہیں، بہر حال یہ دلیل ایک نہایت بودی اور کمزور دلیل ہے جو مزارعت کے جواز میں پیش کی جاتی ہے۔

مزارعت اور تعامل امت

ایک اور دلیل جو مزارعت کے جواز میں پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ اس پر چودہ سو سال سے امت کا تعامل رہا ہے۔ اگر یہ ناجائز ہوتی تو امت مسلمہ اس پر عمل کیوں کرتی، گویا اس پر عمل ہوتے رہنا اس کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ ایک حدیث کے مطابق پوری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔

یہ دلیل غور سے دیکھا جائے تو ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کیونکہ پوری امت مسلمہ نے نہ متفقہ طور پر مزارعت کو جائز سمجھا اور نہ کبھی اس پر عمل کیا ہے بلکہ ہر زمانے میں علماء کے درمیان اس کے جواز و عدم جواز کے متعلق بھی اختلاف رہا ہے اور مسلمانوں میں اس پر عمل کرنے اور نہ کرنے کے متعلق بھی اختلاف رہا ہے۔ خیر القرون کی عظیم اکثریت نے نہ اسے جائز سمجھا اور نہ اس پر عمل کیا جیسا کہ اس کتاب میں پیچھے خاصی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین میں چوٹی کے علماء نے مزارعت کو ناجائز کہا اور ائمہ اربعہ میں سے تین نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا اور اس سے مسلمانوں کو روکا جیسا کہ آپ گذشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔ اور جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا کہ اسلام میں تعامل کا کچھ اعتبار ہے تو اس تعامل کا جو خیر القرون اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں رہا ہو اور جس کی ابتداء صحابہ کرام سے ہوئی ہو، بعد

کے زمانوں کے مسلمانوں کے تعامل کا کچھ اعتبار نہیں جبکہ نہ معاشرت اسلامی رہی اور نہ معیشت اسلامی، نہ سیاست اسلامی رہی اور نہ ثقافت اسلامی، تقریباً ہر چیز بدل گئی اور بے شمار ایسی چیزیں جو اسلام کے بالکل خلاف تھیں مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک اور لاینحل حصہ بن گئیں اور بعض ناعاقبت اندیشوں اور کوتاہ بینوں نے دور از کار تاویلوں کے ذریعے متعدد کو اسلامی ثابت کرنے کی مذموم کوشش بھی کی۔

بہرحال یہ کہنا کہ امت مسلمہ کا مزارعت پر تعامل رہا ہے، خلاف واقعہ اور جھوٹ ہے۔ جن لوگوں کا مزارعت پر عمل رہا ہے ان کی تعداد پوری امت مسلمہ میں پانچ فیصد بھی ثابت نہیں کی جا سکتی، امت مسلمہ میں جن لوگوں کا پیشہ اور ذریعہ معاش زراعت تھا وہ دو طبقوں پر مشتمل تھے۔ ایک طبقہ مالکان زمین اور زمینداروں کا تھا اور دوسرا مزارعین اور کاشتکاروں کا، مالکان زمین اور زمیندار جو کاشت کاروں کے مقابلہ میں پانچ فی صد بھی نہ تھے بعض ان میں سے مزارعت کو ناجائز سمجھتے اور اپنی زمینیں خود کاشت کرتے تھے اور بعض اسے جائز سمجھتے اور اس پر عمل پیرا تھے۔ ان میں سے جو مزارعت کو جائز سمجھتے اور اس پر عمل پیرا تھے وہ اس لئے نہیں کہ مزارعت کے جواز کے دلائل ان کے نزدیک عدم جواز کے دلائل سے زیادہ قوی اور زیادہ قابل اعتبار تھے یا ان فقہاء کو وہ علم و فہم اور تفقہ و تقویٰ میں دوسرے فقہاء سے اعلیٰ و برتر سمجھتے تھے جن کی طرف مزارعت کے جواز کا فتویٰ منسوب تھا یعنی ایسا نہیں تھا کہ وہ مثلاً قاضی ابو یوسف کو امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے مقابلہ میں علم و فہم، تفقہ و اجتہاد کے لحاظ سے بڑا سمجھتے ہوں لہٰذا انہوں نے مزارعت کے جواز کے متعلق ان کے فتویٰ کو ترجیح دے کر اختیار کر لیا ہو، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ مزارعت کے جواز کا قول ان کے مفادات سے مطابقت رکھتا اور ان کے مفید مطلب تھا لہٰذا انہوں نے اسے اختیار کر لیا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ جہاں تک ان مزارعین اور کاشت کاروں کا تعلق تھا جو مزارعت پر زمینیں کاشت کرتے تھے، ان کا مزارعت پر عمل بادل نخواستہ اور بامر مجبوری تھا۔ اپنی مرضی خوشی سے نہ تھا۔ وہ معاشی لحاظ سے پسماندہ اور خستہ حال تھے لہٰذا وہ اگر ایسا نہ کرتے تو بھوکوں مرتے اور معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوتے، علاوہ ازیں ان کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی حیثیت زمیندار طبقہ کے ہاتھوں میں یرغمال اور غلاموں کے سی تھی۔ وہ ہر اس فیصلے کو ماننے پر مجبور تھے جو زمیندار اور جاگیردار طبقہ کی طرف سے سامنے

آتا۔ چنانچہ جب زمیندار طبقہ نے اپنے مفادات کی خاطر مزارعت کو قائم رکھنے اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر کاشت کار طبقہ کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اس فیصلہ کو مانیں اور اس کے مطابق کام و عمل کریں، مطلب یہ کہ مسلمانوں میں جن لوگوں کا اپنی آزاد مرضی اور خوشی سے مزارعت پر عمل تھا وہ ہر دور میں مسلمان معاشروں کے اندر نہایت قلیل تعداد میں تھے۔ لہٰذا مزارعت پر ان کے تعامل کو امتِ مسلمہ کا تعامل کہنا خلاف واقعہ اور سراسر غلط ہے بلکہ گمراہ کن ہے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ کہ تاریخ بتلاتی ہے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا اس وقت دنیا کے تمام زرعی ممالک میں جاگیرداری نظام رائج تھا۔ جس کی بنیاد مزارعت و بٹائی پر قائم تھی۔ اور جس کے تحت زراعت سے تعلق رکھنے والے لوگ دو مختلف طبقوں میں منقسم تھے ایک طبقہ مالکانِ زمین کا تھا اور دوسرا مزارعین کا۔ اوّل الذکر طبقہ معاشی لحاظ سے خوشحال اور معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے معزز اور بااثر طبقہ تھا جبکہ اس کے مقابلہ میں ثانی الذکر طبقہ معاشی لحاظ سے پس ماندہ، معاشرتی لحاظ سے پست و گرا ہوا اور سیاسی لحاظ سے غلام و محکوم اور یہ حالت دونوں طبقوں میں موروثی طور پر اور پشت در پشت چلی آرہی تھی، پھر جب ان میں سے بعض ممالک کے اندر دینِ اسلام پھیلا اور ان کی بڑی آبادی مشرف بہ اسلام ہوئی تو من جملہ دوسرے مسائل کے مزارعت و بٹائی کا مسئلہ بھی سامنے آیا جس پر مروجہ جاگیرداری اور زمینداری نظام قائم تھا، اور یہ پتہ چلا کہ فقہاءِ اسلام کے درمیان اس مسئلے کے متعلق اختلاف ہے بعض اس کو جائز اور بعض ناجائز کہتے ہیں تو جاگیردار و زمیندار طبقہ کو اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ بعض فقہاء کی رائے کے مطابق ان کا جاگیرداری نظام اپنی سابقہ حالت پہ قائم و برقرار رہ سکتا اور ان کی سابقہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالت کو تحفظ مل سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے قطع نظر اس سے کہ قرآن و حدیث کی رو سے جواز مزارعت والی رائے صحیح اور قوی ہے یا عدم جواز والی رائے، یا یہ کہ جواز اور عدم جواز کی رائے دینے والا کون ہے اور کون نہیں، مزارعت کے جواز والی رائے کو لے لیا اور حسبِ سابق اس پر سختی کے ساتھ کاربند ہو گئے۔ اور اپنی سابقہ حیثیت اور پوزیشن کو بحال رکھا۔

ظاہر بات ہے کہ اگر مزارعت کے عدم جواز والے فتوے پر عمل ہوتا تو معاشرے

کا پورا ڈھانچہ بالکل تبدیل ہو جاتا۔ زمیندار و جاگیردار طبقہ اپنی جملہ خصوصیات و مراعات کے ساتھ ختم ہو جاتا، غیر فطری معاشرتی اور سماجی اونچ نیچ مٹ جاتی اور مساوات کی حالت پیدا ہوتی۔ اور وہ گوناگوں سماجی برائیاں بھی ناپید ہو جاتیں جو نظام جاگیرداری کا خاصہ اور لازمہ تھیں، اب زرعی زمین کا مالک وہ ہوتا جو اسے خود کاشت اور آباد کرتا اور کاشت کاروں کو آزادی کی نعمت ملتی، وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بنتے، ان کا معاشرتی درجہ بلند ہوتا اور وہ عزت کے ساتھ مدارج ترقی طے کرتے اور مسلسل آگے بڑھتے، غرضیکہ مزارعت کے عدم جواز پر عمل ہوتا تو معاشرے میں ایک نہایت خوشگوار انقلاب رونما ہوتا اور ایسے حالات وجود میں آتے جن میں سب کو امن و اطمینان کے ساتھ تعمیر و ترقی کا موقع ملتا اور آج اسلامی دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

بہر حال مزارعت کے ناجائز و ممنوع ہونے کی صورت میں جاگیرداری و زمینداری نظام کا خاتمہ لازمی تھا۔ لہٰذا زمیندار اور جاگیردار طبقے نے اس رائے کو دبانے اور اس کے مقابلہ میں جواز مزارعت کی رائے کو ابھارتے اور بروئے کار لانے میں اپنا پورا زور اور سارا اثر و رسوخ صرف کیا اور بعض علمی حلقوں کی تائید حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے، اس طرح مزارعت کے عدم جواز والی بات کتابوں اور دینی مدرسوں میں تو رہی لیکن عملی طور پر سامنے نہ آسکی۔ خصوصاً ان معاشروں میں جہاں فقہ حنفی کا چرچا تھا۔

مزارعت کو جائز قرار دینے اور رائج کرنے میں اس سیاسی نظام کا بھی بڑا کردار اور عمل دخل تھا جو خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت اور بادشاہت کی صورت میں اسلامی ممالک کے اندر قائم ہوا، بادشاہت کے اس سیاسی اور حکومتی نظام کی بنیاد نظام جاگیرداری پر قائم تھی اور نظام جاگیرداری مزارعت و بٹائی کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔ حکومت کے مختلف عہدوں اور منصبوں پر فائز حضرات کو ان کی خدمات کے عوض دربار شاہی سے بڑے بڑے قطعات اراضی اور علاقے ملے ہوئے تھے جن کی آمدنی ان کی معاشی خوشحالی کا اہم ذریعہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات ان طویل و عریض اراضی کو خود تو کاشت کر سکتے تھے نہیں، اپنے منصبی کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے نہ ان کے پاس فرصت تھی اور نہ وہ اس پیشے کو اپنے شایان شان سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے ان اراضی سے فائدہ اٹھانے کی صرف یہی صورت تھی کہ وہ ان کو مزارعت اور اجارہ پر دیتے اور جواز مزارعت کی رائے کو اختیار کر کے اس پر عمل پیرا

ہوتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جاگیرداری پر مبنی شاہی نظام حکومت کے اندر مزارعت عملاً جائز قرار پائی اور اسے سہارا ملا۔ اور چونکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ حکومت جو ایک طاقتور سیاسی ادارہ ہے جس چیز کی حمائت اور سرپرستی کرتی ہے وہ ضرور قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے علماءِ دین کے فتوے اس کے خلاف عملاً بے اثر ثابت ہوتے اور دب کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی واضح مثال مسلم ممالک میں موجودہ بنکاری نظام کی ہے۔ جمہور علماء اسے ربوٰی نظام کہہ کر اس کے حرام و ناجائز ہونے کا فتوٰی دے چکے ہیں لیکن چونکہ اس کو ہر جگہ حکومتوں کی حمائت، سرپرستی اور پشت پناہی حاصل ہے، لہٰذا علماء کے فتووں کے علی الرغم یہ نظام قائم اور ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے اور تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے، اگر ماضی میں ایسا ہی معاملہ، مزارعت پر مبنی نظام زمینداری کے ساتھ ہوا ہے تو اس میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں جبکہ مزارعت کے جواز کے متعلق بھی فقہاء کے ہاں ایک کمزور سی رائے موجود تھی۔ اور بعض اس کے جواز کے قائل تھے۔

اور پھر جس طرح آج کے مسلمان سرمایہ دار اپنے مفاد کی خاطر سود پر مبنی نظام تجارت وصنعت کو اختیار کر سکتے اور اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں حالانکہ سود قطعی طور پر حرام ہے تو ماضی کے مسلمان جاگیر دار و زمیندار اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مزارعت پر مبنی نظام زمینداری کو کیوں اختیار نہ کر سکتے تھے جب کہ مزارعت کے عدم جواز کے ساتھ گو بے وزن سہی لیکن جواز کی بات بھی موجود تھی۔

پھر اگر آج کے مسلمانوں کا سودی کاروبار پر تعامل بعد والوں کے لئے سود کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا تو ماضی کے مسلمان زمینداروں کا زمینداری نظام پر تعامل ہمارے لئے مزارعت کے مطلق اور قطعی جواز کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟

خلاصہ یہ کہ عہد صحابہؓ کے بعد مسلمانوں کا تعامل بذات خود نہ کسی بات کے جواز کی دلیل ہے اور نہ عدم جواز کی بلکہ اگر تعامل کتاب وسنّت اور قرآن وحدیث کے مطابق ہے تو جائز اور مخالف ہے تو ناجائز کیونکہ اسلام میں کسی چیز کے جائز اور ناجائز ہونے کا اصل معیار اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے۔ اور بس! علماء کا اجماع بھی شرعاً وہی معتبر ہے جس کی سند کتاب وسنّت میں موجود ہو اور قرآن وحدیث کے کسی منصوص حکم کے خلاف نہ ہو، اور قیاس تو صحیح ہوتا ہی وہ ہے جس کی اصل قرآن وحدیث میں پائی جاتی ہو۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ جب مزارعت کے عدم جواز کا قول کتاب وسنت کے دلائل کے لحاظ سے زیادہ قوی اور زیادہ قابل اعتماد تھا اور ائمہ مجتہدین کا اختیار کردہ تو پھر فقہاء متأخرین خصوصاً اصحاب الترجیح نے جواز کے قول کو عدم جواز کے قول پر کیوں ترجیح دی اور اسے فتویٰ کا مدار کیوں بنایا یعنی اُسے مفتی بہ اور علیہ الفتویٰ کیوں ٹھہرایا ؟

اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ایسا اپنے وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر کیا، مطلب یہ کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ اس وقت معاشرے کے جو ذہنی اور خارجی حالات ہیں ان میں مزارعت کے جواز والا قول قابل عمل اور عدم جواز والا قول تقریباً ناقابل عمل ہے، لاکھ اسے ناجائز کہا جائے جن لوگوں کا اس سے مفاد وابستہ ہے وہ اسے کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تو انہوں نے قابل عمل ہونے کی وجہ سے جواز والے قول کو عدم جواز والے قول پر ترجیح دے کر اس کے مطابق فتویٰ دے دیا۔ لیکن چونکہ اس فتوے کے ساتھ اس قسم کی کوئی وضاحت نہ تھی کہ یہ فتویٰ مخصوص حالات کے پیش نظر ہے جو اس وقت موجود تھے قرآن وحدیث کے اصل منشأ کے مطابق نہیں لہٰذا بعد والے غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ فتویٰ قرآن وحدیث کے عین مطابق اور قطعی وآخری طور پر ایک صحیح اسلامی فتویٰ ہے رفتہ رفتہ مزارعت کے عدم جواز والی بات ہی ذہنوں سے نکل گئی اور یہ کھٹکا ہی ختم ہوگیا کہ وہ ناجائز بھی ہوسکتی ہے۔ اب اگر اس کا کہیں ذکر رہا تو صرف حدیث وفقہ کی پرانی کتابوں اور علمی درسگاہوں میں رہا اور وہ بھی زیادہ تر تاریخ کے پیرائے میں۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا گیا اس وقت علماء کے سامنے اسلام کے معاشی نظام کا کوئی مسئلہ نہ تھا بلکہ ان کے وہم وخیال میں بھی یہ نہ تھا کہ آگے چل کر ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ دنیائے انسانیت میں معاشی نظام کی اہمیت بنیادی ہوگی اور مسلمانوں کو یہ چیلنج درپیش ہوگا کہ وہ اسلام کی معاشی تعلیمات کو سائنٹیفک علمی طریقہ سے ایک مرتب نظام کی شکل میں پیش کریں جس میں اصول، مقاصد اور غائت کے مابین قابل فہم عقلی اور منطقی ربط ونظم اور ہم آہنگی ہو اور پھر دلائل سے یہ بتلائیں کہ اسلام کا معاشی نظام، اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام وغیرہ معاشی نظاموں سے کیسے بہتر اور زیادہ مفید ہے اور یہ کہ اگر مسلمان علماء اس چیلنج کا اطمینان بخش جواب نہیں دیں گے تو اس کا برا نتیجہ نکلے گا کہ بہت سے نام نہاد مسلمان غیر اسلامی ازموں کا شکار ہوجائیں

گے محض اس وجہ سے کہ ان کا معاشی نظام اچھا اور بہتر ہے۔ جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔
میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے ان علماء و فقہاء کے سامنے مذکورہ باتیں ہوتیں تو وہ کبھی بھی مزارعت کے متعلق علی الاطلاق جواز کا فتویٰ نہ دیتے اور پوری احتیاط کے ساتھ ضرور یہ سوچتے کہ اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی و بہتری مزارعت کے جواز میں ہے یا عدم جواز میں اور پھر یقیناً اس نتیجے تک پہنچتے کہ عدم جواز کی رائے ہی ہر لحاظ سے بہتر اور صحیح رائے ہے اور اسی کے ذریعے ایک معتدل و متوازن معاشی ماحول کے قیام میں مدد مل سکتی ہے جس کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

بہر حال اب یہ ذمہ داری دورِ حاضر کے علماء کرام کی ہے کہ وہ اس قسم کے اختلافی معاشی مسائل کا از سر نو تحقیقی جائزہ لیں اور پوری کوشش و کاوش کے ساتھ اجتہادی طریقہ سے یہ معلوم و متعین کریں کہ ان کے متعلق مختلف آراء میں سے کونسی رائے حقیقت میں صحیح اسلامی رائے ہے تاکہ اسلام کے حقیقی معاشی نظام کا تعین ہو سکے جس کی آج اشد ضرورت ہے۔ اس بے جوڑ، منتشر اور مختلف آراء کے ہوتے ہوئے اسلامی معاشی نظام کا کبھی تعین نہیں ہو سکتا۔

دراصل اسی احساس ضرورت کے تحت زمینداری کے موضوع پر یہ مقالہ لکھا گیا، مقصد یہ تھا کہ مزارعت و بٹائی کے جواز اور عدم جواز سے متعلق صدیوں سے جو اختلاف چلا آ رہا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے اسلام کے معاشی نظام کا تعین مشکل بلکہ ناممکن و محال ہے، وہ اختلاف دور کیا اور یہ پتہ چلایا جائے کہ ان دو مختلف اور متضاد اقوال میں سے کونسا قول حقیقت میں اسلامی قول ہے اور کونسا غلطی سے اسلامی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ اسلامی نہیں، اپنے علم و فہم اور وسائل علم کے مطابق میں نے مقصد مذکور کے لئے انتہائی اور امکانی کوشش کی ہے اور وہ تمام دلائل تفصیل اور شرح و بسط نیز جرح و نقد کے ساتھ یک جا بیان کر دیئے ہیں جو مزارعت کے جواز اور عدم جواز سے متعلق مختلف علماء کرام نے پیش کئے اور متفرق کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس میں طالب علمانہ انداز سے جو محنت و کاوش کی گئی ہے اس کا اندازہ کتابوں کی اس فہرست سے بخوبی ہو سکتا ہے جن سے لکھنے کے دوران براہ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ میری یہ کوشش و کاوش کامیاب ہے یا ناکام، یا کس حد تک کامیاب اور کس حد تک ناکام ہے اس کا فیصلہ تو حقیقت پسند اور منصف مزاج اہل علم ہی کر سکتے ہیں البتہ میں اظہارِ حقیقت کے طور پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کے لکھنے کا محرک سوائے اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

کے دوسرا کوئی جذبہ نہ تھا۔ بہرحال یہ ایک غیر معصوم انسان کی انفرادی کوشش ہے لہٰذا اس میں غلطیوں کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، جو صاحب مجھے ان پر متنبہ کریں گے، میں ان کا ممنون و شکر گزار ہوں گا۔

—— بقیہ ' معاشرتی بہبود کا تعارف ' ——

تصوّرِ معاشرتی بہبود ایک نتیجہ خیز بنیادی فلسفے، نظریئے یا تصوّر سے خالی ہے۔ اس کے تصوّر میں ایثار یا سرے سے ہے ہی نہیں یا اس کا فقدان ہے۔ فلاحِ انسانیت کی اس مفید تحریک کو بار آور کرنے کے لئے اسے اس فلسفۂ زندگی اور تصوّرِ حیات سے وابستہ کرنے کی ضرورت ہے جو انسان کی سوچ اور دل و دماغ کی اصلاح کرتا اور جو اس کی اندرونی کیفیت میں عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ اسی جاندار تصورِ زندگی کا تعمیری اور اصلاحی پروگرام کا تقاضا اسلام ہم سے کرتا ہے۔

—— بقیہ ' قرآنی ادب و ثقافت کا ایک پہلو ' ——

یُفْتَنُوْنَ (ماخوذ از التوبہ: ۱۲۶۔) صفحہ: ۲۲۷۔

۳۔۔۔ علمائے امت کو ان کے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے صفحہ ۲۳۶-۲۳۷ پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ان کی قرآنی آیات کے اقتباسات پر قدرت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

تاہم یہ سب کچھ عربی کے علم، مہارت اور ذوق کی باتیں ہیں۔ اب تو ہم مسلمانوں کا رجحان دینی سے زیادہ مادی اور ذوق عربی سے زیادہ انگریزی ہو گیا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی،

مسلمانوں کا وہ آئینِ طبع مستقل بدلا
چھٹی عربی، گیا قرآں زباں بدلی تو دل بدلا۔

قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر ڈاکٹر ابصار احمد، کا تحریر کردہ جواب
جو پاکستان ٹائمز کی ۱۸، ستمبر ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا

Dr. Israr's new course

Apropos your correspondent's letter captioned 'Dr. Israr's new course' (P.T. Sept. 7) I have to submit that it very clearly and unwittingly brings out the fallacious thinking entertained even by the educated elite of the country regarding the separation of the sciences and scientific disciplines from religion. The respectable correspondent believes that education in religious matters should be imparted only to arts graduates at the Quran Academy and candidates with science and professional degrees should be discouraged from taking such courses at full time regular basis. My considered opinion, on the other hand, is that greatest need for the true Islamisation of Society is that of integrating science and technology with religion. There can be no doubt that Islam is relevant to all aspects of thinking, of living, of being. This relevance must be articulated unmistakably in each discipline, intelligently and at the scholarly level. There is no denying the fact that the prime agent disseminating the alien and colonial view (represented so very cogently by the earlier correspondent) has been the educational system, bifurcated as it is into two sub-systems: one, 'modern university type' and the other 'Islamic Madrasah type'. This bifurcation and chasm is the epitome of Muslim decline. And happily Dr. Israr Ahmad propses just to bridge this gap and integerate the 'secular' and the 'religious'.

Indeed, by taking up this much-needed educational venture, Dr. Israr Ahmad is following the path, suggested by the poet-philosopher of the East — Allama Mohammad Iqbal in his famous Lectures, titled Reconstruction of Religious Thought in Islam. Who can deny that Iqbal was the greatest Muslim Luminary who emphasised the integration of science with the fundamental verities of Islam. And for achieving or at least moving towards that envisaged goal he established the modest Darul Islam Institute at Pathankot. Moreover, the learned correspondent should know that the thinking on which the courses of the Quran Academy are based are not new even in the west. I have come to know from reliable sources that in Utah (USA), Mormons, the majority population of that state, have since long passed a legal provision according to which all girls and boys have to spend two years for acquiring religious training after completing their high school level.

Islam wants all its adherents to be its preachers and propagators. It does not at all favour the creation of a special class of clergy. Of course, the ultimate aim of Dr. Israr Ahmad's course is to produce such scholars who present Islam to the world at the highest intellectual level. But short of that, we surely need enlightended and educated Khatibs and Ordinary preachers. Again, professional with a considerable amount of religious knowledge are expected to do better in their respective fields and at the same time project Islamic values in a convincing manner.

I beg the learned correspondent to kindly think from the point of view of a true and committed Muslim. It is highly time that we realise that Muslim Ummah is suffering from a threateningly dangerous malaise and the said course attempt to apply a cure — certain to restore to the Ummah its health and Islamic indentity, as well as to nudge it forward on its predestined role of responsible world leadership.

Dr. Absar Ahmad, Honorary Director,
QURAN ACADEMY
36-K Model Town, Lahore

Regd. L. No. 3193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol 3 | SEPTEMBER-OCTOBER 1984 | No. 7-8

قرآن اکیڈمی کی نئی تعلیمی اسکیم کے بارے میں پاکستان ٹائمز (اشاعت ۷ ستمبر ۸۴ء)
میں شائع ہونے والے تنقیدی خط کا عکس ۔

Dr. Israr's new course

Dr. Israr Ahmad has many admirers and I count myself as one of them. His dedication to Islam is worthy of approbation. He is also a medical man and I am writing this letter to address him in his dual capacity, in connection with his proposed new course at his Quran Academy.

This course will be a whole-time course, lasting two years. The participants will receive Rs. 1,000 per month as stipend, and then after completion of the course salary equivalent to Grade 17.

One would have imagined that ideal candidates for such a course would be arts graduates with a religious bent of mind and proficiency in Arabic -- and preferably those who have no encumberances, such as being the sole bread-winners of poor and struggling families. The point I wish Dr. Israr to ponder is whether graduates with professional degrees be considered eligible for this course. In my humble opinion if professional young men (such as engineers, economists, scientists) wish to join this course at the cost of their profession, Dr. Israr should advise them not to abandon their careers but pursue them with dedication and sense of service, while at the same time taking up an evening course at his Quran Academy for religious studies. I would even suggest that Dr Israr should refuse to accept them for this wholetime course.

I am sure Dr. Israr can give a hundred convincing arguments in favour of abandoning wordly persuits. But I would request him to view this problem from a father's angle who has sacrificed for years to make his son an engineer or a scientists and who cannot now afford to lose him entirely to religion as an occupation. For that matter, can this backward, underdeveloped country afford that either? -- A KHAN, 15-Abu Bakr Block, New Garden Town, Lahore.